الہنڈر
۲۰۱۴



یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا

ایڈیٹرز (المہندس)

سال	جنرل ایڈیٹرز	اردو ایڈیٹرز
۲۰۰۲	ظہیر عباس	قیصر سجاد
۲۰۰۷	عمران الٰہی الاشاری	فہیم اختر
۲۰۰۸	عمران الٰہی الاشاری	مہرین کوثر
۲۰۰۹	عمران عمر لودھی	شعیب منیر
۲۰۱۰	عمار فلک شیر	شعیب اشرف طور
۲۰۱۱	حسن رضا	محمد حسن
۲۰۱۲	نعیم الحسنین	رمیض حسن
۲۰۱۳	توقیر خالد	وقاص مراتب
۲۰۱۴	محمد قاسم ضیاء	مستبشرہ فاروق

ٹائٹل پیج اور ٹیمپلیٹ ڈیزائن
سعد اقبال (10-Civil)
میڈیا منیجر (گرافکس ایکسپرٹ)

Almohandis
Facebook: facebook.com/thealmohandis
Blog: almohandisblogs.wordpress.com
Email: almohandis@uettaxila.edu.pk
Pinterest: pinterest.com/uettdiaries

QR for IPAD

List of Editors, Almohandis

Year	General Editors	English Editors
2006	Zaheer Abbas	Umbreen Sabir
2007	Imran Ilahi Lashri	Sumaira Azad
2008	Imran Ilahi Lashri	Momal Qureshi
2009	Imran Umar Lodhi	Momal Qureshi
2010	Ammar Falak Sher	Quratulain Shafi
2011	Hassan Raza	Salman Latif
2012	Naeem ul Hussnain	Komal Aslam
2013	Tauqeer Khalid	Saad Ayub Jajja
2014	Muhammad Qasim Zia	Saad bin Shams

Title Page and Template Design

Saad Iqbal (10-Civil)

Media Manager (Graphics Expert)

QR for IPAD

Almohandis

Facebook: facebook.com/thealmohandis

Blog: almohandisblogs.wordpress.com

Email: almohandis@uettaxila.edu.pk

Pinterest: pinterest.com/uettdiaries

Almohandis '14

UNIVERSITY OF ENGINEERING AND TECHNOLOGY, TAXILA



شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔

اُس کے نام سے جس کے سب نام ہیں۔
جسے بغیر کسی نام کے بھی پکارا جا سکتا ہے، یاد کیا جا سکتا ہے۔

ALMOHANDIS

یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، ٹیکسلا

مجلسِ ادارت سنہ ۲۰۱۴



وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عباس چوہدری
پیٹرن اِن چیف



پروفیسر ڈاکٹر قیصر الزمان
چیف ایڈیٹر



محمد قاسم ضیاء
جنرل ایڈیٹر

اردو مجلسِ ادارت



مستبشرہ فاروق (مدیر اردو)
10-CP-99



محمد شہزاد
10-ENC-65



قاسم علی
10-EE-70



محمد حسن سرفراز
11-IE-47



ذیشان خالق
11-CE-189



محمد احسن عباسی
12-EE-153



محمد آفتاب احمد
12-ME-88



احسن الرحمان
12-IE-17



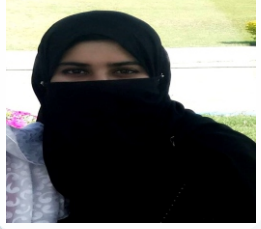
انیقہ صفدر
12-SE-30



محمد حسنین بلال
13-ME-58



ہاشم علی
13-TE-89



نفیسہ بی بی
13-SE-02

انگلش ایڈیٹوریل بورڈ



سعد بن شمس (انگلش ایڈیٹر)
10-EE-85



علیشبہ کنول
10-EE-124



فیضان احمد
10-SE-142



زید بن فاروق
11-ME-46



شفق ملک
11-TE-93



نیناں اعما نوائیل
11-CP-67



فہمیدہ اشرف
11-ME-151



فیضان امجد
12-SE-74



فہد اسحاق
12-ME-133



کنزہ ماہم
12-EE-40



عُزیر منظور
13-CE-177

میڈیا کلب



بلال احمد (میڈیا ایڈوائزر)



سعد اقبال (میڈیا مینیجر)
10-CE-141



عبداللہ مقصود
10-CE-106



محمد ملحان ناز
10-CE-165



نعمان چوہدری
10-SE-105



محمد عثمان خان
11-CP-61



توقیر شوکت
11-CE-20



نعمان آصف
10-TE-147



وقار یونس
11-EE-71



حسنین رضا
11-CE-68



وجاہت علی
12-EE-12

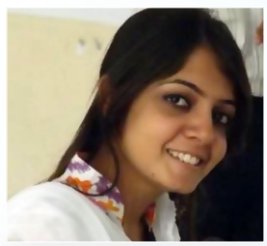


حفصہ عزیز
12-ME-137

آرگنائزنگ کمیٹی



عرفان خان (آرگنائزنگ ہیڈ)
10-TE-15



رمشہ فاطمہ
10-ENV-08



فہد پرویز
10-CE-38



عمر ریاض
11-TE-95



غلام مرتضیٰ
11-CE-187



معظم شہزاد
11-SE-179



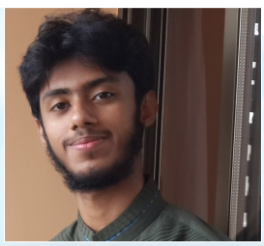
نایاب کیانی
11-EE-104



عدنان عظیم کندی
11-CE-19



سیدہ تحریم زہراء
11-EE-110



محمد عبداللہ
12-ME-118



حمزہ حنیف چوہان
12-CE-25



صائم رؤف
12-EE-130



وقاص اسلم
12-CE-37



تحسین مقصود
12-CE-92



حذیفہ حسین
12-CE-100



احمد عثمان دیوان
12-CE-118



حافظ علی رضا
12-IE-38



خدیجہ محفوظ
12-CE-26



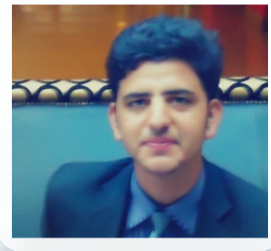
ماہ رخ
12-EE-06



شفق رحمان
12-CE-30



شفیعہ جہانگیر
13-TE-40



محمد عمیر
13-IE-29



کائنات افضل منہاس
13-IE-39



ملیحہ ممتاز
13-TE-16

اردو مجلسِ ادارت



آرگنائزنگ کمیٹی



مجلسِ ادارت سنہ ۲۰۱۴





اداریہ

حضرتِ انسان کو دنیا میں وارد ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں مگر انسان آج بھی وہی غلطیاں دہرانے پہ مائل ہے جو صدیوں قبل اس کے پُرکھوں نے سرانجام دیں۔قدرت کی عطا کردہ عقلِ کل جس کے باعث وہ اشرف المخلوق کہلایا، کو بس چند فیصد ہی استعمال کر پایا ہے۔اس نفس کے پجاری انسان کی حقیقت تو یہ ہے کہ باوجود موت کا عندیہ درج ہونے کے پھر بھی تمباکو بھری سگرٹ سلگا لیتا ہے۔اور تمباکو کی ڈبیا بیچنے والا بھی عندیہ درج کر کے اپنے آپ کو فارغ الحصاب سمجھتا ہے۔سودا گر آج بھی جیبیں گرم کر رہے ہیں اور قدرت کے اس غیر یقینی اور فانی نظام کا کوئی پاس نہیں۔

تو پھر ارتقاءِ انسانی کی کہانی کیا جھوٹی ہے؟ جستجو، ایجاد اور تحقیق و تخلیق کے قصے بے معنی ہیں؟ بنی نوح نے جب علم و دانائی کے محور میں قدم رکھے تو اس میں فلسفہ، معاشرت، معیشت، سیاست، رومانویت، تکنیکیات، غرض ہر پہلوِ زندگی میں وہ گوہرِ نایاب تلاش کر ڈالے کہ فکر و سوچ کا اک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو کہ ہر قسم کے قفس سے آزاد بس بڑھ رہا ہے، پھیل پھول رہا ہے۔

اس سب کے باوجود کیا وجہ ہے کہ انسان آج بھی بھوکا اور بے گھر ہے؟ ظلم میں پس رہا ہے؟ اپنے بھائی کا قتل کرنے پہ آمادہ نظر آتا ہے؟ اور کپڑے کے ایک ٹکڑے کی خاطر عزت کا سودہ کر لیتا ہے؟ کیوں آج بھی انسان ہاتھ پھیلانے کا وطیرہ اپنائے ہوئے ہے؟ صحیح وجہ تو واللہ و عالم مگر سوچ کے پلڑے میں اس کو ناپیں تو چند وجوہات اظہر من اللہ میں ہیں جن کے تناظر میں پایہ جانے والا یہ تضاد دریافت ہوتا ہے۔

مٹی کا یہ پیکر اپنے اندر جس روح کو سموئے ہوئے ہے وہ آج بھی ناخوش نظر آتی ہے۔اخلاقی پستی اور مادہ پرستی نے اس روح کو اتنا زنگ آلود کر دیا ہے کہ دل و دماغ کو تسکین پہنچانے کے یہ جتنے جتن کرے، روح میں پیدا فسردگی کا کوئی پرسانِ حال معلوم نہیں پڑتا۔مزہب میں فرقے اور ذاتیں ہیں تو تصوف میں ذات کی نفی۔اور دِہریت میں دیکھو تو خود پرستی۔الغرض انسان آج بھی ماضی کے جھروکوں، حال کے جھنجھٹوں اور مستقبل کی فکر میں اپنی ذات کا متلاشی ہے۔ادب انسان کو اپنی تلاش کے اس سفر کو قلمبند کرنے کا نا صرف مؤثر ذریعہ ہے بلکہ ان تمام بے یقینیوں کا مداوہ ہے جو انسان کو نا اُمید کرتی ہیں۔اور ادب کا یہ ساتھ ہی شاید انسان کو آج حیوان بننے سے روکے ہوئے ہے۔

اُمید واثق ہے کہ آپ کے ہاتھ میں اس وقت موجود المہندس شمارہ ۲۰۱۴ آپ کی توقعات پر پورا اترے گا کہ اس میں محبت کی چاشنی، صداقت کی خوشبو، ریاضت کا خلوص، محنت کی عظمت، ساتھیوں کی رفاقت، انتظار کی حلاوت اور آپ سب کی دعاؤں کا ثمر شامل ہے۔غلطیاں، کوتاہیاں معاف ہوں۔ واسلام۔

مدیر

محمد قاسم ضیاء



اداریہ

ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں اس میں ذہنی کشمکش اور دل گرفتی سے نجات نہیں۔ جب دل بے سکونیوں کا شکار ہو۔ نامعلوم اداسیوں نے گھیر رکھا ہو۔ تو ان حالات میں چند مثبت فقرے، شیریں خیالات، پر لطف واقعات، کچھ رنگا رنگ اور خوش آہنگ اشعار اچانک فضا کو منور کر دیتے ہیں اور یوں کچھ لمحوں کے لیئے ہی سہی ہم اپنے ذہنی تناؤ سے کچھ نجات پا جاتے ہیں۔ جذبات دل اور احساسات لازم وملزوم ہیں۔ دل کا ہونا احساسات کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے۔ مگر آج کے مشینی دور میں شاید احساسات کہیں لاشعور کی وادیوں میں پنہاں ہیں۔ اور کہیں غفلت کے دبیز پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ دنیا اب بہت زیادہ مادہ پرست ہوگئی ہے اور سماج میں سبقت کا جذبہ بہت تیز ہو گیا ہے۔ آج کے دور میں الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے جہاں سماجی رویوں کو متاثر کیا ہے وہیں اردو ادب کے بہت سے حربے الیکٹرانک میڈیا کی گود میں پہنچ گئے ہیں۔ اب لوگ پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ صرف اردو ادب کا ہی نہیں ہر زبان کا ہے۔ مگر تحریری لفظوں کی اہمیت آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ الفاظ کی کہانی انسانی ارتقا کی کہانی ہے۔ الفاظ جذبات اور قلب انسانی کی مختلف حالتوں کا عکس ہوتے ہیں۔ یہ لاشعوری احساسات کو شعوری احساسات میں بدل دیتے ہیں۔ اور یوں ادب کی بدولت احساسات شیرازہ بندی کے حسن سے آشنا ہو کر قلب و ذہن کے افق پر اجالا کرتے ہیں۔ تعلیمی اداروں خاص کر انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں ادب کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ آج ذہن بہت دور ان پگڈنڈیوں پر گامزن ہے جن کا سرا ماضی سے ملتا ہے جب میں المہندس میں ممبر منتخب ہوئی۔ میں آج بھی اس وقت کے مدیر اردو کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے المہندس میں شمولیت کا شرف بخشا اور میں المہندس سے وابستہ ان تمام لوگوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ المہندس ۲۰۱۴ کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اس میں جدت لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ آنے والے شمارے مزید ہمہ گیری لائیں گے۔ اور میں اُمید کرتی ہوں کہ احساسات کے مدوجزر میں المہندس آپ کے ساتھ رہے تو یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ میں مستقبل میں اسکی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

دعاؤں کی طلبگار

مدیر اردو

مستبشرہ فاروق

حمد باری تعالیٰ جل جلالہٗ

جلال تیرا ، جمال تیرا، جہاں میں حرف کمال تیرا
عطا ہے یہ جسم و روح تیری دلوں میں ہر دم خیال تیرا

بدیع و صالح ہے ذات تیری قرآن سچا ہے بات تیری
صداقتوں کا ہے تو حوالہ ، زمانہ تیرا ہے حال تیرا

یہ چاند تارے ، یہ سب نظارے ، چمکتا سورج ، دھکتا تارا
درخت و دریا نسیم و طوفاں یہ نیلا و سبز و لال تیرا

ہر ایک ذرہ تیری حکایت ، ہر ایک لمحہ تیری عنایت
جو مٹھیوں میں سنبھال رکھ وہ وقت وہ ماہ و سال تیر

شریک کوئی نہیں ہے تیرا، وحید ہے لاالہ ہے تو
صفات و عادات و آیتوں میں نہ ذات میں ہے مثال تیرا

ہوا کو ، پانی کو، آگ و مٹی کو، تو نے پیدا کیا ہے لیکن
جو شرف نوع بشر کو بخشا کرم ہے وہ لازوال تیر

مجھے پکارا تجھے بلا پھر اپنے من میں تجھے بسایا
سکوں ہوا، اطمینان پایا جو دل میں پایا جلال تیرا

کرم سے جھولی کو بھر کے رکھنا فقط تیرے در کا منگتا ہوں
حقیر ہوں میں فقیر ہوں میں تو شہنشا سب یہ مال تیرا

حافظ اسد الرحمٰن
10-CP

وہ شبہ جہاں وہ دل آرا
وہ عزیز جاں مرا پیارا

مرا شوق میری صدا ہے تو
میری منزلوں کا پتا ہے تو
دم حشر حرف ندا ہے تو
کہ ستم کے بدلے دعا ہے تو

مری بخششوں کا سوال تو
بے نظیر تو بے مثال تو
ہے رخِ بشر کا جمال تو
حسنت جمیعُ خصال تو

ترا خلق اعلیٰ قرآن ہے
تری شان گویا ایمان ہے
تو سراپا حق کا نشان ہے
تو ہی انبیا کا امام ہے

ترا چہرہ ہے رخ والضحیٰ
تری زلف لیل ادا سجی
ہے وجود پورا تر بھلا
تو ظہور حق میں ہے بر ملا

تری سادگی تری زندگی
تری زندگی تری بندگی
تری بندگی تری عاجزی
تری عاجزی تری سروری

مجھے کیا پتا تری ذات کا
میں غلام لات و منات تھا
یہ کمال تھا تری بات کا
وہ ملا جو حرفِ حیات تھا
تری سنتوں کا دخل نہیں !

ترے قول پہ کیوں عمل نہیں ؟؟
تری زندگی مرا حل نہیں ؟؟
تری سوچ کیوں مرا دل نہیں ؟؟

حافظ اسد الرحمٰن
10-CP

فکر و نظر

13 حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ
محمد عبداللہ

15 قائداعظم اور سیکولرزم (اسلام سے پاکستان)
ذیشان خالق چودھری

17 رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی
سبطین علی

19 میں نے انسان کو انسان نگلتے دیکھا ہے
ذیشان مرتضی

21 ملت اسلامیہ کا عروج و زوال
محمد عامر

23 تشریف نہ رکھئے
ڈاکٹر صباحت قدوس

25 پاکستان کی خودمختاری/سالمیت
محمد عارف

27 اخلاص کی بستی میں جا کہ تو دیکھو
حدید اللہ

30 اب تو مسلم کو مسلمان سے ڈر لگتا ہے
شاھد محمود

32 اپنی مدد آپ
حنہ علی

34 جلد ہو دیں سیات سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
محمد سھیل

36 جو ہو ذوقِ یقین پیدہ
غلام مرتضیٰ

37 کون کہتا ہے کہ پتھر نہیں روتے؟
حفصہ انعم

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہم

محمد عبداللہ
11-ME-192

نام عثمان، ابوعبداللہ اور ابوعمر کنیت، ذوالنورین لقب، والد کا نام عفان تھا اور والدہ کا اروی تھا۔ عام الفیل کے چھ برس بعد یعنی ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا جود وسخا، حلم وعطا، عشق مصطفیٰ ﷺ جذبہ وشوق اور آنحضرت ﷺ سے والہانہ تعلق ایک ایسی کہانی ہے جو اغیار میں بھی مسلم ہے۔ ماہتابِ رسالت ﷺ کے روشن ستاروں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام بہت نمایاں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا چونتیسواں سال تھا کہ مکہ میں توحید کی صدائے غلغلہ انداز بلند ہوئی۔ گو ملکی رسم ورواج اور عرب کے مذہبی تخیل کے لحاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے یہ آواز نامانوس تھی، تاہم وہ اپنی فطری، عفت، پارسائی، دیانتداری اور راستبازی کے باعث اس داعی حق کی پکار پر لبیک کہنے کے لئے بالکل تیار تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو انہوں نے دین مبین کی تبلیغ واشاعت کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اپنے حلقہ احباب میں تلقین و ہدایت کا کام شروع کیا۔ ایام جہلیت سے ان میں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں تعلق تھا اور اکثر نہایت مخلصانہ محبت رہتی تھی۔ ایک روز حسب معمول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اسلام کے متعلق گفتگو شروع کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سے آپ اتنا متاثر ہوئے کہ بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہو کر خود سرور کائنات ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ ابھی دونوں بزرگ جانے کا خیال ہی کر رہے تھے کہ خود سرور کائنات ﷺ تشریف لے آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا ''عثمان! خدا کی جنت قبول کر، میں تیری اور تمام خلق کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوا ہوں''۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ زبان نبوت کے ان سادہ وصاف جملوں میں خدا جانے کیا تاثیر بھری تھی کہ میں بے اختیار کلمہ شہادت پڑھنے لگا اور دست مبارک میں ہاتھ دیکر حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فیاضی اور سخاوت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک مرتبہ بڑا ہی شدید قحط پڑا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ملکیت میں ایک ہزار بوری غلہ موجود تھا۔ جسے اہل مدینہ بڑی سے بڑی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار تھے مگر آپ نے تمام غلہ مفت تقسیم کر دیا اور فرمایا کہ باری تعالیٰ مجھے ایک درہم پر دس درہم منافع عطا فرمائے گا۔ ایک مستند روایت کے مطابق حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تقریباً اسی لاکھ اشرفیاں راہ خدا میں خرچ کر دیں۔ آنحضرت ﷺ کے گھر میں تین چار دن فاقہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ شرف وسعادت بھی زیادہ تر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوتا کہ آپ یہ اطلاع پاتے ہی گندم اور کھجور کی بوریاں پیش کر دیتے۔ اس کے علاوہ ان کی سخاوت کے واقعات اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔

آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ کے نکاح میں آنحضرت ﷺ کی یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں آپ کے نکاح میں آئیں۔ اسی وجہ سے آپ کو ذوالنورین یعنی ''دونوروں والا'' کہا جاتا ہے۔ اب عساکر میں ہے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ''حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت ﷺ تک کوئی انسان ایسا نہیں گزرا جس کے نکاح میں کسی پیغمبر کی دو بیٹیاں آئی ہوں سوائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں ہر نبی کا ایک ساتھی ہوگا، میرا

ساتھی عثمان ہوگا۔‘‘

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ذو النورین کا دور ۱۲ سال پر محیط تھا۔اس عہد میں قابل سے لے کر مراکش تک وسیع و عریض خطہ اسلام کے سایہ عاطفت میں رہا۔شرافت وحیاء بے نفسی آپ کا طرہ امتیاز تھا۔خلفاء میں آپ کو سادہ مزاجی، عاجزی اور فروتنی میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ان کے حالات کو سمجھنے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک قول ملاحظہ ہو جسے ایک قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے:

’’جس وقت میں نے منصب خلافت قبول کیا تھا میں پورے عرب میں اونٹوں اور بکریوں کا سب سے زیادہ مالک تھا اور آج میرے پاس حج کے دو اونٹوں کے سوا ایک اونٹ اور ایک بکری بھی نہیں۔‘‘

اسلام کے اس درخشندہ ستارے کو چالیس روز تک بھوکا و پیاسا رکھنے کے بعد انتہائی بے دردی کے ساتھ اٹھارہ ذوالحجہ کو تلاوت قرآن کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان حضرات کی تعلیمات پر عمل کرنے والا بنائے جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیا۔تا کہ ہم دنیا میں بحیثیت قوم مسلم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیں۔اللہ آپ کا اور میرا حامی و ناصر ہو۔(آمین)

سنہری باتیں

۱۔ انسان کی اصل قدر اس کے وطن سے باہر ہی ہوتی ہے۔ جہاں اُسکی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

۲۔ جس کے پاس کیرکٹر سرٹیفکیٹ نہیں سمجھو کہ اُسکا کچھ اخلاق نہیں۔اُسکی نیک چلنی مشتبہ ہے۔

۳۔ آپ تسلیم کریں گے کہ جس قوم کے لوگ آپس میں نہیں لڑ سکتے، وہ باہر والوں سے کیا لڑیں گے۔

۴۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے سورج کو کبھی طلوع ہوتے دیکھا ہی نہیں کی کتنی بار دیکھا ہے، فلموں میں بڑا اچھا لگتا ہے۔ (ابنا نشاء)۔

۵۔ کاہلی میں جو مزا ہے، وہ کاہل ہی جانتے ہیں۔بھاگ دوڑ کرنے والے اور صبح صبح اُٹھنے والے اس مزے کو کیا جانیں!

۶۔ دنیا میں جتنے کام کئے، کاہلوں نے کئے، بھاگ دوڑ کرنے والے کیا کر سکے ہیں؟

۷۔ جھوٹ کے تین درجے ہیں۔جھوٹ، سفید جھوٹ اور اعداد و شمار۔

۸۔ ہم اُس وقت تک پچیس سال کے نہیں ہوتے جب تک ہماری شادی نہیں ہوتی۔

۹۔ جو شخص سیدھی بات نہ کہہ سکے یا سیدھی بات کو موثر نہ پائے وہ کہانیاں کہتا ہے۔

قائداعظم اور سیکولرزم (اسلام سے پاکستان)

ذیشان خالق چودھری
11-CE-189

ایک بہت پرانی حکایت سنی تھی جس میں ایک شخص اپنے مردہ باپ کی قبر پر لاتیں مار رہا تھا اور اسکی تذلیل کر رہا تھا کہ باپ نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا حالانکہ حقیقت میں اس کے رویہ سے اُکتا کر اس کے گھر والوں نے اس بے دخل کر دیا تھا۔ مگر اپنے رویے میں تبدیلی لانے کی بجائے وہ اپنے باپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ آج اس حکایت کی حقیقت کچھ سمجھ میں آئی جب اپنے ہی لوگوں کو ایمان ،اتحاد اور تنظیم پر عمل کرنے کی بجائے بابائے قوم کے خلاف محاذ گرم کرتے ہوئے کوشاں پایا۔

آج اس موضوع پر عمل کشائی کرنا کچھ اس لئے اچھا نہیں لگ رہا کہ ہمیں اپنے ہی لوگوں کو حضرت قائد کے مقام سے روشناس کروانے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ ہماری ہستی اس قابل نہیں کہ ان کے بارے میں کچھ رائے قائم کر سکیں، جناب قائد پر تنقید کرنے والے یہ اسلام اور پاکستان کے نام نہاد علمبردار گزشتہ کئی دہائیوں سے ظلم کرتے آئے ہیں۔ اسلام کے ساتھ، پاکستان کے ساتھ اور اس عالم اسلام کے عظیم رہنما کے ساتھ جس نے مصائب اور الم کے دشت و دریا عبور کرتے ہوئے مسلمان کو درحقیقت مسلمان کا تشخص عطا کرنے کے لئے دن و رات کے فاصلے مٹا دیے اور ہماری ساعتوں کو ''یہ ریڈیو پاکستان ہے'' سے بہرہ مند فرمایا۔ آج کچھ لوگ اس قائد کو جو میرے خیال میں بلا شبہ کہانی پاکستان کا ایک لازمی سچ تھا اسی کو جھوٹ ثابت کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں اور اس پہ ستم یہ ہے کہ قائد سے بغض رکھنے کے باوجود پاکستانی کہلوانے کے دعوے دار بھی ہیں۔

یہ لوگ گزشتہ کئی دہائیوں سے قائد کے اس کمال کو جو جہاں میں کوئی اور نہ کر سکا بھلا کر ان کی تصویرِ اقبال کی عظیم تعبیر کی کاوش کو فراموش کر کے اس کی ذات، کردار اور دین پر حملے کرتے رہے کہ وہ لادین تھا، غیر ملکی ایجنٹ تھا، وہ مسلمانوں کی حمایت کا دعویٰ کرتا تھا مگر خود اسلام سے نابلد تھا بلکہ بعض کانگریسی ملاؤں کی طرف سے کافر بھی قرار دیا گیا مگر میری عقل نافہم کے مطابق ہر کسی نے انکو اپنے ظرف کے مطابق جانا۔

احسان فراموشی ہماری فطرِ ثانیہ بن چکی ہے، ہم نے اپنی روایت کے مطابق ہر اس شخص کی ہستی کو جس نے ہماری اصلاح کی کاوش کی ۔کو اس قدر مسخ کیا کہ تاریخ بھی ورطہ حیرت میں پڑ گئی۔ ایسی ہی ایک ہستی جناب قائد کی ذات بھی ہے۔ ہمیں چونکہ محسنوں کی قدر کرنا نہیں آتا اسی لئے آج جب قائداعظم کے اقوال وقت کی ضرورت ہیں ہم ان اقوال کو پس پشت ڈال کر ان کی شخصیت کو لے کر ایک نئی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تاریخ کی شاہراہ پر گامزن ہوں اور پیچھے مڑ کر امیرِ ملت پیر جماعت علی شاہ سے پوچھیں کہ محمد علی جناح کو انگریز نظر آتا ہے جو اُردو بھی نہیں جانتا تو ان کا جواب یہ ملتا ہے کہ تم اس کے ارادوں کو نہیں جانتے۔ یہ ہمارا کام کر رہا ہے یہ اللہ کی طرف سے تفویض کردہ ڈیوٹی پر ہے۔ اسی شاہراہ پر چلتے ہوئے جب مفکرِ پاکستان علامہ اقبال سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے جناح کا ساتھ کیوں دیا تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ خیانت کریں گے نہ جھکیں گے اور نہ ہی بکنے والے ہیں۔

ایسی عظیم شخصیات کے جناح کے بارے میں ایسے نظریات کے سامنے ہمارے سطحی خیالات مُشتِ خاک سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ قائداعظم تو اُس ہستی کا نام ہے جو جب محمد علی جناح تھے تو اُس وقت کے ہزاروں روپے صرف تفریح کی نظر کر دیتے ہیں۔ مگر وہ مردِ مومن جب محمد علی جناح سے قائداعظم بنتے ہیں تو مادرِ ملت کے لئے قومی خزانے سے سات روپے کی کرسی رکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ کیا آج کے دور میں ان پر تنقید کرنے والوں میں سے کوئی ایسے ظرف کا حامل ہوسکتا ہے؟ نہیں بالکل نہیں کیونکہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی
بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے
چمن میں دیدہ ور پیدا

چمن برصغیر میں پیدا ہونے والا یہ دیدہ ور جناب قائد ہی تھے وہ ایک تحفہ خداوندی تھے غلہ می کی چکی میں پس رہے برصغیر کے مسلمان کے لئے تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں تو وہاں ایک واقعہ نظر آتا ہے۔ شاہ برطانیہ کے بھائی جب پاکستان آنے کے خواہاں ہیں تو بادشاہ کی خواہش تھی کہ جناب قائد ان کا استقبال کریں۔ جوآپ نے جواب دیا کہ میں ضرور جاؤں گا مگر یہ شرط ہے کہ جب میرا کوئی عزیز انگلستان جائے تو بادشاہ اس کا استقبال کرے۔ یہ جواب ایک طمانچہ ہے ان پر انگلستان کی وفاداری کا لیبل لگانے والوں پر اس جواب سے آپ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری
کیا ہے

کوئی اندازاہ کرسکتا ہے کہ یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جس نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی انگلستان میں ہی گزاری تھی۔ ایسے گوہرِ نایاب کے بارے میں پھیلائی جانے والی خرافات دراصل مغرب کے غلام طبقہ کی ایجادات ہیں ایک مسلمان اور سچے پاکستانی کی سوچ تو ہرگز نہیں۔

اب یہ وقت کی ضرورت ہے کہ ان سب اختراعات کو پس پشت ڈال کر یہ دیکھا جائے قائداور انکے رفقاء نے یہ ملک اس لئے بنایا تھا کہ اسے اسلام کا قلعہ بنایا جائے یہاں ہر کسی کو واشگاف اللہ اکبر کہنے کی آزادی دی جائے اور آج اگر روحِ قائد ہم سے ہم کلام ہو تو انکا پہلا سوال یہی ہوگا 'تم کو جو لے کر دیا تھا میرا وہ پاکستان کہاں ہے'۔ اس لئے آج ہماری یہ اولین ذمہ داری بنتی ہے کہ لغو بحث اور غیر حقیقی خیالات کو جھٹک کر اس ملک کو صحیح معنوں میں اقبال اور قائد کا پاکستان بنائیں تاکہ روزِ قیامت ہمیں بارگاہِ خداوندی میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ ہمیں اس ملک کی پاسبانی کی ذمہ داری دی گئی ہے ہم اس کے پاسبان ہیں اور اگر ہم اسکے بانی کی پاسبانی نہیں کرسکتے تو کیا اس کی پاسبانی کے قابل ہیں؟؟؟

ذرا

سوچئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟؟؟

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

علی سبطین
11-ENV-94

اذا تو ہوتی ہے اب بھی مگر
نہیں کوئی موذن بلالؓ سا
سر بسجدہ تو ہیں مومن مگر
نہیں کوئی زہراؑ کے لعل سا

صبح صادق کے دھندلے میں، روشن اور گرم دوپہر میں، سُرمئی شام اور پھر رات کی تاریکی میں روزانہ دنیا کے گوشے گوشے میں ایک آواز بلند ہوتی ہے۔ 'اذان' یہ آواز چودہ صدیوں سے اسی تسلسل کے ساتھ بلند ہو رہی ہے۔ ہر دور میں اس آواز نے یکساں کلمات ادا کئے ہیں۔ یہ کلمات اس کے ماننے والوں کا سرمایہ افتخار ہیں جسے لیکر نبی آخر الزماں ﷺ یثرب کی سرزمین پر اُترے۔ ان کلمات میں وہ رعب و دبدبہ ہے جو بڑے بڑے جابروں کو اسیر کر دیتا ہے۔ روئے زمین پر ان کلمات کو سب سے پہلے بلند کرنے کی سعادت خادمِ رسول ﷺ موذنِ اسلام حضرت بلالِ حبشیؓ بن رُباہ کے حصہ میں آئی۔

آپ پیکر زہد و قناعت، کاملِ عشق و محبت تھے جن کی پُر تاثیر، پُر خلوص آواز مکہ میں گونجتی تھی اور اگر اذان نہ دیتے تو سحر نہ ہوتی تھی۔ اس صدائے تکبیر سے مشرکین کے قلوب رنج و الم سے بھیگ جاتے تھے اور عالم کشف میں ان کلمات کی تاثیر جنت کا سماں باندھتی تھی۔

اور پھر مرجع عالی قدر ہستی کا تاریخی سجدہ جو انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ جی ہاں! نواسہ رسول ﷺ جگر گوشہ بتولؑ نورِ عین علیؑ نے یوم عاشور کرب و بلا کی تپتی ہوئی سرزمین پر ہزاروں کی دندناتی ہوئی جفاکش فوج اور اسلحے کی چھنکار کی موجودگی میں ایسی ناقابل تردید عشق الٰہی کی مثال قائم کی جسے تا قیامت بقا اور دوام حاصل ہو گیا۔ امام حسین ؑ رضا الٰہی کے حصول کے لئے اور اُسکی مشیعت کو اپنی خواہشات پر مقدم رکھتے ہوئے ایسی بے مثال قربانی پیش کی کہ تا قیامت قبولیت عامہ حاصل ہو گئی۔ بقول شاعر ؎

توحید کی چاہت ہو تو کرب و بلا چل
ورنہ یہ گلی کھُل کے کھِلی ہے نہ کھِلے گی
مسجد کی صفوں سے زرا مقتل کی طرف دیکھ
توحید تو شبیر کے سجدے میں ملے گی

مگر صد افسوس ایک تلخ حقیقت ہے کہ دورِ حاضر کا مسلمان آپس کی کدورتوں، رنجشوں، تعصّبات اور نفرتوں کی بناء پر دینِ اسلام کی اصل روح سے دست بردار ہو چکا ہے۔ نہ عبادات میں سرور باقی ہے نہ اعمال میں خلوص عیاں، نہ رشتوں میں پاکیزگی کا پاس نہ عواطف و احساسات میں فخر و محبت۔ غرض ہر عمل اسلامی نکتہ نظر کی پاسداری کرنے سے گریزاں ہے۔ مسلمانوں نے اپنی منزلت اور شخصیت کی معرفت کھو دی ہے۔ مسلم اُمّہ فتنہ و فساد، بے نظمی، بے سروسامانی، ظلم و استداد اور ناانصافی سے لبریز ہے۔ اس پس ماندگی پر نظر ثانی کی جائے تو جو وجوہات سامنے آتی ہے ان میں مسلمانوں کی خستہ دینی حالت محکم ہے۔ اسلام کے اور قرآن کے نام لیوا ناپید ہو گئے ہیں۔ مسلمان صرف برائے نام مسلمان ہے۔ مساجد

میں پُر تاثیر وعظ ونصیحت کا فقدان ہے۔ زمانے کے فقہائے دین روئے زمین کے بدترین فقیہہ بن گئے ہیں۔ دین کو کم قیمت چیزوں کے بدلے بیچا جارہا ہے۔ قرآن معاشرے میں موجود تو ہے مگر تنہا تحریر کی صورت میں عبادت گاہیں جو تبلیغِ دین اور دینی ہدایت کا مرکز ہیں، اپنی اہمیت اور وقعت کھو بیٹھی ہیں۔ نیز دینی تعلیم کے بجائے مسجد کی خوبصورتیوں اور تعداد میں اضافہ ہورہا ہے جبکہ مساجد مومنین سے خالی ہیں۔ عبادتوں کو فقط عادتاً سرانجام دیا جارہا ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان پل میں مومن ہے اور پل میں کافر۔ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے باوجود بھی شیطانی خصلتوں سے محفوظ نہیں اور ہر بدفعلی سے ہاتھ ملانے کے لئے آمادہ ہے۔ بشریت کے دفاع کے دعوے دار مسلمان آج اپنے مفاد کی خاطر دوسرے مسلمان کی جان کا دشمن ہے اور اختلاف، انتقام، تفرقہ بازی، نفرت، بغض وکینہ کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔

قرآن جو مکمل ضابطہ حیات ہے اور نماز جو دنیا پسندی، تکبر، عُجب، فریب اور نفس پروری سے بچاتی ہے مگر دور حاضر کے مسلمان نے ایمان کی روایات ایسی تار تار کر ڈالیں کہ احکامات کی روح مفلوج ہوکر رہ گئی ہے۔ بلاشبہ کتاب الٰہی، سنت وسیرتِ نبوی ﷺ بالکل محفوظ ہیں۔ لیکن ان پر عمل پیدا کرنے والے غفلت سے مغلوب ہیں اور صد افسوس کہ مسلمانوں کے قلوب واذہان اس اثاثہ دین کے مثبت اثر ورسوخ سے عاری ہیں۔ اگر ان پر عمل پیدا ہوجائے تو جبر کے خلاف ڈٹ کر تمام فرعونی طاقتوں کو فی النار کرسکتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا نوجوان مسلمان قرآن کو ضابطہ حیات تسلیم کرنے کی بجائے اپنے آپ کو طفل تسلیاں دینے میں مصروف ہے۔ مسلمانوں کی فکر وسوچ کی تشکیل نو درکار ہے۔ دین تو زندہ ہے مگر اس پر عمل پیرا ہونے والا مسلمان خوابِ غفلت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آج کا مسلمان بظاہر عابد، عارف اور عالم تو ہے مگر عشقِ الٰہی اور عشق رسول ﷺ سے بے بہرہ ہے۔ عشقِ الٰہی کا تو تقاضا ہے کہ پیشانی مرضی الٰہی کے آگے سجدہ ریز ہو اور ظلم وجبر کے طلاتم کے آگے ثابت قدم رہے اور عشق واطاعت توحید سے ایسا سرشار ہوجائے کہ موت بھی اس پر فتح نہ پاسکے۔ اور وہ موت کو یوں مسخر کرے کہ:

حلق پر تیغ رہے، سینے ہپ جلاد رہے
لب پہ ذکرِ ترا، دل میں تیری یاد رہے۔

غرض یہ کہ سجدہ وتکبیر کی کھوئی ہوئی منزلت کو پھر سے پُر تاثیر کرنے کے لئے قرآن کریم کا بیان کردہ نسخہ کیمیا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا یعنی اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ ہمیں اسے اپنا نصب العین بنانا ہوگا اور ایک خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوکر پیکرِ واحد میں ڈھلنا ہوگا۔

"میں نے انسان کو انسان نگلتے دیکھا ہے"

ذیشان مرتضی (اول، پری رٹن تحریری مقابلہ)
13-EE-82

اسلام احترام انسانیت اور خدمت خلق کا درس دیتا ہے اور کسی بھی ایسے امتیازی فرق کی اجازت نہیں دیتا جس سے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی توہین ہوتی ہو۔لیکن آج کل کا معاشرہ نفسانفسی، بے حسی اور خودغرضی کی تصویر نظر آتا ہے۔ دورِ انسانیت مفقود ہوتا جارہا ہے اور محبت والفت کی جگہ نفرتیں اور کدورتیں پرورش پارہی ہیں۔

چلتے پھرتے مُردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

آج کا انسانی معاشرہ ایسے افراد سے بھرا پڑا ہے جو حقوق اللہ کی آڑ میں حقوق العباد کو سلب کر لیتے ہیں۔ نیز بظاہر بڑے پرہیز گار، متقی اور نیکوکار دیکھائی دیتے ہیں۔لیکن غریبوں اور یتیموں کا مال کھانے اور حقداروں سے ناانصافی برتنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود حیوانی روپ دھار چکا ہے اور انسانی حقوق کو پامال کررہا ہے۔آج اس دنیا میں ڈنڈے سے سروں پر حکومت کرنے والے آمر، پابندِ سلاسل کرنے ظالم و جابر، جبر و استبداد کے نیچے گاڑنے والے جابر اور سامانِ حرب و ضرب سے دہشتیں پھیلانے والے شیطان صفت انسان موجود ہیں۔جن کے دل سے انسانیت نکل چکی ہے۔مال وزر، اقتدار و کرسی اور عزت وشہرت کی محبت نے انسانیت سے محبت کا گلا دبا کر رکھ دیا ہے۔ خودغرضی و مفاد پرستی نے خدمت انسانیت کے احساسات و جذبات چھین لئے ہیں۔غرور وتکبر کے نشے میں چور درندہ صفت لوگ اپنی آمریت وچنگیزیت دکھا کر معصوم اور بے گناہ انسانوں کو اپنی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنارہے ہیں۔انسانی معاشرہ شائستہ صفات سے محروم ہوچکا ہے۔دوسروں کے کام آنے کا جذبہ موجود نہیں۔کوئی انسان اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر نہیں دیکھتا اور اپنی ہی زندگی میں مگن ہے۔

انسانی معاشرے میں حیوانی نظام مسلط کیا جارہا ہے۔ جہاں ہر کوئی اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے۔ دوسروں کے دکھ درد کی کوئی پرواہ نہیں ۔کوئی بھی برائی اور ظلم وستم ایسا نہیں جو آج کے انسانی معاشرے میں نہ پایا جاتا ہو۔چھینا جھپٹی، حق تلفی، اونچ نیچ اور مفاد پرستی نے دردِ انسانیت جیسے پاکیزہ جذبے کو کچل کر رکھ دیا ہے۔آج ہمارے معاشرے میں کرپشن، دہشت گردی، بھتہ خوری، ناانصافی ، بے روزگاری، مہنگائی، کساد بازاری اور خودغرضی کا وائرس تیزی سے پھیل رہا ہے۔آئے روز دہشت گردی کے واقعات میں معصوم اور بے گناہ عوام اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔انسانی خون پانی سے بھی ارزاں ہوچکا ہے۔غریب اور مزدور طبقہ دو وقت کی روٹی کمانے کی فکر میں پریشان ہے۔جبکہ اہل اقتدار طبقہ عیاشیوں میں مصروف ہے ۔ ان کے پاس سب اختیارات ہیں جنہیں استعمال کرتے ہوئے وہ ناجائز طریقوں سے غریب عوام کا مال ہتھیانے میں مصروف ہیں۔آج کے انسان نے سائنسی ترقی کی منازل تو طے کرلیں لیکن انسان بن کر زندگی گزارنا نہیں سیکھا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کا گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کر نہ سکا

ہر طرف نفسا نفسی اور آپا دھاپی کا ماحول ہے۔ خواتین کے حقوق پامال ہو رہے ہیں' عفت و حیا محفوظ نہیں۔ قانون کے رکھوالے قانون شکن بنے ہیں۔ صحت کی جگہ زہر فروخت ہوتا ہے۔ انسانیت کے ساتھ وہ سلوک کیا جا رہا ہے جسے دیکھ کر دل لرز اُٹھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے انسان جنگل میں زندگی گزار رہا ہے جہاں انسانی حقوق کا کوئی خیال نہیں۔

انسانی معاشرے کے یہ حالات دیکھ کر دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ کوئی بھی دردِ انسانی اور خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والا انسان ایسے حالات نہیں دیکھ سکتا۔ وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا سمجھ کر جیتا ہے اور یقیناً آج ہمارے معاشرے میں ایسے ہی انسانوں کی ضرورت ہے جو دوسروں کے دکھ درد کی دوا بنیں۔

آج کائناتِ انسانی کو ایسے متوازن روحانی و مادی نظام کی ضرورت ہے۔ جس سے دنیا کا گوشہ گوشہ ہمدردی و الفت، امن و سلامتی اور خدمتِ خلق کے جذبے سے معمور ہو جائے۔ یقیناً ایسا نظام حیات صرف نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ سے ملتا ہے۔ جو خلقِ خدا کو باوقار طور پر جینے اور دوسروں کے کام آنے کا درس دیتا ہے۔ آیئے! ہم اپنا مقصدِ حیات بنائیں کہ:

خلقِ خدا کی خدمت بے لوث کر کے ہم
تخلیق کائنات کا مقصد بتائیں گے

ملت اسلامیہ کا عروج وزوال

محمد عامر 13-IE-23

اُمت مسلمہ کے عروج کا وہ زمانہ کہ جب جلالِ مسلم سے ہر ایک کے دل سینوں میں کانپتے تھے۔عدل وانصاف سر چڑھ کر بولتا ابنِ خطاب ؓ کے ایک کوڑے کی ہیبت تھرتھراتی زمین کو تھما دیتی۔وہ زورِ حیدری ؓ،عزمِ ابی وقاص ؓ اور فقرِ ابوذر ؓ جو قیصر وکسریٰ کے محلات میں لرزہ طاری کر دیتے۔سلطنتِ روما کو تہہ وبالا کر دیتے۔ اُن کے گھوڑوں کی جولان گاہ سمندر کی اُچھلتی موجیں ہوتیں۔اُنکی نگاہیں آبِ حیا سے غناک اور دل آرزوئے شہادت سے لبریز ہوتے۔غرض کہ ہمارا تخیل اُن کے اوصاف کا مکمل احاطہ کرنے سے ہی قاصر ہے۔

رفتہ رفتہ اس ملک کا سوز عرب،ساز عجم سے بدلنے لگا۔خلافت پر ملوکیت کی نحوست چا گئی۔عزت کے مزے لوٹنے والے ذلت پہ فدا ہوگئے۔گردوں پر جمانے والی قوم پستیوں کی حد سے گزرنے لگی۔ بزمِ جہاں کو علم سے چراغاں کرنے والے جہالت کی عمیق تاریکیوں میں کھو گئے۔حقیقتِ اسلام کو خرافات،روایات اور اختلافات میں اُلجھا کر رکھ دیا گیا اور دیکھتے ہی مسلمان کا رُعب و وقار،عزت و ہیبت خاک میں مل گئے۔اقبال اس دور کی دل سوز انداز میں غمازی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رُخصت ہو
آسماں سے آبرِ آذاری اُٹھا برسا گیا

وقارِ مسلم کا بادل چھٹنے کی دیر تھی کہ دنیائے کفر بیگانہ وار اس ملت پر ٹوٹ پڑی۔موجودہ زمانے پر ہی اگر نگاہ دوڑائی جائے تو ہم نے دیکھا کہ غزہ کے معصوم بارود کی بارش میں نہلا دیے گئے۔عراق و افغانستان میں ظلم کے کوہ گراں توڑے گئے کشمیر میں عصمت دری کی مثالیں قائم ہوئیں۔زہریلی گیس کی زد میں آئے شام کے مسلمان تڑپا تڑپا کر مار دیے گئے۔برما کے مسلمان باشندے زندہ جلا دیے گئے اور اب تو ہم وسطی افریقہ کے مسلمانوں پر سے بلڈوزر گرائے جانے کا منظر بھی دیکھتے ہیں۔لیکن رنئے حادثے کے بعد ہماری بے بسی پہلے سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے کیونکہ:

ہوگیا مانند آبِ ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

دنیا میں صرف وہی قومیں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہیں جو ہر زماں اپنے اعمال کے پیشِ نظر اسباب عروج وزوال کی جستجو کرتی ہوں۔ ہم بھی عصر رواں کو دیکھتے ہوئے اسبابِ تنزل معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ایک اہم اسباب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی حیثیت سے بیگانہ ہو چکا ہے۔وہ اپنی آنکھوں میں شعار اغیار کو سموئے اس تہذیب کا دیوانہ وار دلدادہ ہے کہ جس کی تقلید سے روحِ مسلم کا سوز وساز چھن چکا ہے۔یہ اُس تہذیب کا ہی کیا دھرا ہے کہ خدمتِ والدین کو متاع حیات جاننے والا مسلمان آج انہیں اولڈ ہومز کی زینت بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔جس کے اسلاف ابن قاسمؒ کی صورت میں ناموس ابروائے مسلمہ کی خاطر تاریخ رقم غرض یہ کہ سجدہ وتکبیر کی کھوئی ہوئی منزلت کو پھر سے پُرتاثیر کرنے کے لئے قرآن کریم کا بیان کردہ نسخہ کیمیا: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا یعنی اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور

تفرقے میں نہ پڑو۔ ہمیں اسے اپنا نصب العین بنانا ہوگا اور ایک خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوکر پیکرِ واحد میں ڈھلنا ہوگا۔

کرتے لیکن آج انہیں کافر زندہ جانشین ویلنٹائن ڈے پر عزت و غیرت کے شیرازے بکھیر دیتا ہے۔ وہ بھی مسلمان تھے جو حلقہ یاراں سے محبت کی ایسی مثال قائم کر گئے کہ جاں کنی کے عالم میں بھی دوسروں کو فوقیت دیتے ہوئے پانی کا ایک گھونٹ حلق سے نہ اُتارتے اور آج خود کو ملتِ اسلامیہ کا فرد سمجھنے والا خونخواری کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے اپنوں ہی کے اعضاء کاٹ کر بوری بند کرتا ہے۔ تو پھر قدرت کا اسلوب بھی اس کو بڑھ کر ذلیل و خوار کرنے سے ہی تکمیل پا سکتا ہے۔

بقائے مسلم اس امرِ مسلمہ میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی اصلیت سے غافل نہ ہو۔ اس کے سینے میں رازِ زندگی کا شرر پنہاں ہے۔ جو صرف پیغام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لحاظ رکھنے سے ہی بھڑک سکتا ہے۔ آج بھی اگر ہم اپنے جسم و روح کو کتاب خداوندی اور آئین رسولِ مختار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آشکار کرلیں جو خدا ہمیں عروج سے ہمکنار کرنے کا وعدہ دیتا ہے۔

اس زمانے میں ہمیں اُمتِ مسلمہ کے عظیم نکتہ داں علامہ اقبالؒ کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے کہتے ہیں:

مسلم استی سینہ رااز آرزو آباددار
ہر زماں پیشِ نظر ''لا یخلف المیعاد'' دار

''یعنی اگر تم مسلمان ہو تو اپنے سینے میں ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کی آرزو زندہ رکھو اور ہر زمانے میں اس بات کو سامنے رکھو کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا''

اسی آرزو کو پروان چڑھاتے ہوئے ہم بھی اپنے سینوں میں امید کے چراغ روشن کرتے ہوئے اپنی ملت کے مقدر پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اگر ظلمت کی ڈراؤنی شب میں لاکھو ستارے اپنا وجود مٹا کر آسمان کو نورِ سحر سے آئینہ پوش کر سکتے ہیں۔ تو لاکھوں معصوموں کا لہو اس ملتِ مرحوم کی آبرو زندہ کرنے کو کیونکر ناکافی ہوسکتا ہے۔ اس قوم میں اب تک وہ گواہر موجود ہیں کہ جن کے دن سایہ تیغ و سپر اور راتیں اشک و آہِ سحر گاہی میں کٹتی ہیں۔

اپنے صحرہ میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ ملتِ اسلامیہ کا وجود کسی فلسفہ یا افسانے کی بنیاد پر نہیں کہ ہر راہ چلتا اس کو مٹانے کے درپے ہوجائے۔ اس کا مٹ جانا تمام بنی آدم کی رسوائی کا باعث ہے۔ اس کائنات کا مستقبل وجود مسلم سے ہی وابستہ ہے کیونکہ مسلمان خدا کا راز دان اور اس جہان میں اُس کا آخری پیغام ہے۔ اگر اس کی ہستی میں ''شرار آبروز'' اور مقاصد فطرت کے جواہر شامل ہوجائیں تو یہ ایسا تابندہ ستارہ ہے کہ جس کی چمک مہر و ماہ کو بھی شرمادے۔ اس کی تخلیق میں وہ لچک ہے کہ دبائے دبتا نہیں بلکہ اُبھرتا ہے۔ اس کے اُبھرنے کی رفتار دیکھ کہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جیسے صبح محشر سے قریب تر ہوتی جائے چلی جائے گی۔ ویسے ویسے پروزِ مسلم ہمدوش ثریا ہوتی چلی جائے گی۔ جس طرح دنیا نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی صورت میں ظہور جلالی کا نظارہ کیا ویسے ہی یہ دنیا قرونِ اُخریٰ کے مسلمانوں کی صورت میں ظہورِ جمالی کا نظارہ بھی کرے گی۔

ہوچکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

تشریف نہ رکھئے

ڈاکٹر صباحت قدوس
Medical Officer, UET Taxila

آیئے جناب تشریف رکھئے، بیٹھئے ، اپنا ہی گھر سمجھئے وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ جملے تقریباً روزانہ ہماری سماعت سے گزرتے ہیں۔کبھی کسی نے یہ نہ کہا ہوگا، کہ تشریف نہ رکھئے۔مگر آج کل کی زندگی اور روٹین میں اگر کوئی آپ سے یہ کہے تو یقیناً وہ آپ کا خیر خواہ ہوگا۔

ہماری آج کل کی ہنگامہ خیز زندگی پر زرا غور فرمایئے۔آپ صبح گھر سے نکلے تو گاڑی، بس یا موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔دفتر یا کالج جا کر سیٹ پر بیٹھ گئے اور گھر واپس آ کر کمپیوٹر یا ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ گئے۔لیجئے زندگی تو بیٹھے بیٹھے ہی گزر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی مشین تشریف رکھنے کے لئے نہیں بنی۔یہی وجہ ہے کہ نماز جو کہ اسلام کا بنیادی اور اہم ترین رکن ہے، وہ بھی قیام، رکوع اور سجود سے ہی کامل ہوتی ہے۔سچ ہے کہ دین کی ہر بات میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔حج، عمرہ کے موقع پر بھی سعی لازم ہے جہاں ایک مقام پر یہ صرف چلنا ہوتا ہے بلکہ دوڑنا بھی ہوتا ہے۔بیت اللہ کا طواف بھی پیدل کیا جاتا ہے۔اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے کہ چلنا پھرنا اور حرکت کرنا انسان کے لئے کس قدر ضروری ہے؟

ایک نئی ریسرچ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جو لوگ دن کے تین گھنٹے یا اس سے زیادہ مسلسل بیٹھ کر کام کرتے ہیں ان میں ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر، ہائی کولیسٹرول، موٹاپا اور دیگر بیماریوں کے ہونے کے 70% زیادہ امکانات ہیں۔کیونکہ بیٹھے رہنے سے انسولین میٹابولزم پر منفی اثرات پڑتے ہیں جو کہ دن میں کسی وقت ورزش کرنے پر بھی زائل نہیں ہوتے یعنی اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صبح وزرش یا واک کریں تو بے شک دن میں بیٹھ کر کام کریں تو نقصان نہیں ہوگا۔تو یہ غلط ہے۔مسلسل بیٹھنے سے جسم کے اہم خلیات میں گلوکوز کی ضرورت کم ہو جاتی ہے۔نتیجتاً خون میں گلوکوز کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔اور انسولین کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔فوراً آگے چل کر ذیابیطس کا باعث بنتی ہے۔خون میں چربی یعنی کولیسٹرول لیول بھی مسلسل بیٹھے رہنے سے بڑھتا ہے۔ظاہر ہے وزن بھی۔وزن بڑھنے سے شخصیت پر تو منفی اثر پڑتا ہی ہے۔مگر صحت پر تو اس سے بہت ہی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔خون میں میں چربی زیادہ ہونے پر انسان امراز قلب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔اور بلند فشارِ خون یعنی ہائی بلڈ پریشر کا بھی شکار ہو سکتا ہے۔

آج کل ہمارے نوجوانوں کا لائف اسٹائل تو زیادہ تر Gagets کے ارد گرد گھومتا ہے۔لیپ ٹاپ، ڈیسک ٹاپ، آئی پیڈ وغیرہ وغیرہ ان سب پر کام کرنے کے لئے وہ گھنٹوں ایک جگہ پر تشریف رکھتے ہیں۔کہیں جانا ہو تو بائیک یا گاڑی پر تشریف رکھتے ہیں۔رہی سہی کسر جنک فوڈ نے پوری کر دی ہے۔برگر، پیزا، KFC، میک ڈونلڈ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ایسے میں صحت کس طرح اچھی رہ سکی ہے۔بہتر ہے۔زندگی میں تناسب لایا جائے۔کھانے پینے کے ساتھ ساتھ ہر کام میں اعتدال کی عادت ڈالی جائے۔

اگر ہم تھوڑی سی کوشش کریں اور اپنی روٹین میں ہی چند عادات کو بدل لیں۔تو ممکن ہے کہ ہماری زندگی اور صحت پر اس کے مثبت اثرات پڑیں۔

یہاں چند تجاویز ہیں جو کہ ہماری تشریف رکھنے کا دورانیہ غیر محسوس طریقے سے کم کرسکتی ہیں۔

☆ اپنے موبائل فون کو کمرے میں رکھنے کے لئے ایک جگہ مخصوص کرلیں خیال رہے کہ یہ جگہ آپ کے بیٹھنے کی جگہ سے کچھ فاصلے پر ہو۔ تاکہ جب بھی فون آئے آپ اُٹھ کر اٹینڈ کریں۔

☆ دفتر یا کالج میں لفٹ کی بجائے سیڑھیاں استعمال کریں۔

☆ جہاں بھی جائیں کوشش کریں ۔ گاڑی ذرا دُور پارک کریں۔ تاکہ مطلوبہ جگہ جانے اور واپس آنے کے لئے تھوڑا چلنا پڑے۔

☆ کوشش کیجئے ایک ہی بلڈنگ یا دفتر میں فون یا انٹرکام کا استعمال نہ کریں۔ اپنی انا کو ایک طرف رکھیے اور فون کی بجائے خود ہی تشریف لے جایئے۔

☆ اپنے چھوٹے چھوٹے کام ملازمین سے کروانے کی بجائے خود کی جائے مثلاً پانی پینا، گملوں میں پانی ڈالنا وغیرہ وغیرہ۔

سنہری باتیں

۱۰۔ ہمارے ملک میں بے ڈگری کے ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ سبزے کی طرح کہیں جگہ نہ ملی تو فٹ پاتھوں پر ہی کائی بن کر جم گئے۔

۱۱۔ علاج پرہیز سے بہتر ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات علاج پر کم، پرہیز پر خرچ زیادہ آتا ہے۔

۱۲۔ بھینس مشہور جانور ہے۔ قد میں عقل سے تھوڑا بڑا ہوتا اور موسیقی سے ذوق رکھتا ہے۔ اس لئے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔

۱۳۔ دودھ دینے والے جانوروں میں پالنے کے لئے سب سے اچھا جانور انسان ہے۔

۱۴۔ پاکستان کے شمال میں پنجاب، جنوب میں سندھ، مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان ہیں۔ یہاں پاکستان خود کہاں واقع ہے، اس پر آج کل ریسرچ ہو رہی ہے۔

۱۵۔ بھارت بڑا امن پسند ملک ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں۔

۱۶۔ جو کام کل ہوسکتا ہے، وہ آج کیوں کیا جائے؟

۱۷۔ صفاچٹ بلیڈ اگر ذرا پہلے ایجاد ہو گئے ہوتے تو کارل مارکس کبھی داڑھی نہ رکھتے۔

پاکستان کی خودمختاری/سالمیت

محمد عارف (دوئم، تحریری مقابلہ)
11-TE-153

وطنِ عزیز پاکستان آج سے کوئی تریسٹھ سال پہلے نا قابل فراموش قربانیوں، بابائے قوم اوران کے نامور ساتھیوں کی انتھک محنت سے معرض وجود میں آیا۔ جس کے حصول کے وقت یہ عزم کیا گیا تھا کہ لاالہ الا اللہ کی بنیاد پر بننے والے اس ملک اسلام کے بنیاد پر بننے والے اس ملک اسلام کو بنیادی اصولوں کے مطابق چلایا جائے گا۔ اس میں اسلامی قوانین وضوابط رائج کئے جائیں گے۔ لیکن اس کے معرض وجود میں آنے کے بعد جتنا اس بنیادی اصول پر عمل ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

1948ء میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد سے ہی ملک میں حالات خراب ہونا شروع ہوگئے۔ 1950ء میں سکندر مرزا کو جب پاکستان کے پہلے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تو ملک بڑے کھٹن مسائل سے گزر رہا تھا۔ ہندوستانی فوجیں پاکستان پر حملے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دے رہی تھیں۔ یہ سلسلہ آج تک چلتا آرہا ہے۔

آزادی کے بعد سے لے کر آج تک دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان کے مابین بڑے پیمانے پر تین جنگیں ہوچکی ہیں۔ جو بالترتیب 1948، 1965 اور 1971 میں لڑی گئیں۔ جس میں سے 1971ء کی جنگ اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں ہندوستان مشرقی پاکستان میں لوگوں میں بغاوت کو ہوا دے کر پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں بنگلہ دیش کے نام سے ایک نیا ملک دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے غیر مسلم ممالک آج بھی پاکستان کے خلاف سازشوں میں سرگرم عمل ہیں، جن میں امریکہ، اسرائیل، روس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جو ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت پاکستان میں انتشار پھیلانے میں مصروف ہیں۔ جن میں پاکستان کی دفاعی طاقت کو کمزور بنانا، معاشی لحاظ سے پسماندگی کی طرف دھکیلنا، مذہبی ترجیحات خصوصاً اسلام سے لوگوں میں دوری پیدا کرنا، اس مقصد کے لئے فرقہ وارانہ فسادات، بم دھماکے کروانا اُن کی منصوبہ بندی کے اہم جزو میں شامل ہیں۔

اکیسویں صدی کے شروع سے لے کر اب تک کے حالات پر نظر ڈالیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ ہمارا ملک کس حد تک مسلسل زوال پذیر ہورہا ہے۔

لمحہ فکریہ؟ آخر اس کا حل کیا ہے؟ اول الذکر ملک میں نظام خلافت رائج کرنا ہوگا، شرعی سزائیں عدالتوں کے اندر لاگو کرنی ہوں گی۔ المیہ یہ ہے کہ پاکستان میں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں تو پھر اس میں اسلامی نظام کیسے لاگو کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایک فرقہ اپنے اصول لاگو کرنا چاہتا ہے تو دوسرا اس کو جھٹلا دے گا، حل یہ ہے جیسا کہ ہمارے ملک کی 97% آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جس میں گو کہ مختلف فرقوں کے لوگ ہیں لیکن تمام مسلمان جن بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے ہیں، مثلاً کلمہ سب کا ایک ہے، تمام حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا آخری نبی مانتے ہیں اور سب کا قرآن مجید پر یقین بھی ہے تو کم از کم ہمیں ان بنیادی عقائد سے مماثل قوانین کو ملک میں رائج کرنا ہوگا۔

ہمیں تمام مسلمانوں کو اختلافات کی حد تک ہی رکھنا ہوگا اسے دشمنی کی حد تک نہیں جانے دینا ہوگا۔ اختلافات تو صحابہ کرام، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اس کو دشمنی میں تبدیل ہونے سے باز رکھا۔ ہمیں اُنہیں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ اس کے بعد اسلامی سرگرمیوں کو ملک میں جاری رکھنا ہوگا۔ تاکہ لوگوں کے ذہن بیرونی سازشی سرگرمیوں کی طرف راغب نہ ہوں۔

فحاشی، عریانی پھیلانے والے عناصر کا ملک سے صفایا کیا جائے۔ تمام غیر اخلاقی اور اسلام کے اصولوں کے خلاف سرگرمیوں کا سختی سے جائزہ لیا جائے۔ غیر ملکی عناصر ''جس ملک کو تباہ کرنا مقصود ہو اُس کے نوجوانوں میں فحاشی پھیلا دو'' کو سامنے رکھ کر اس پر عمل کرتے نظر آرہے ہیں۔ ہمیں ان کے عزائم کو ناکام بنانا ہوگا۔ اس مقصد کے لئے نوجوانوں، اساتذہ کرام اور والدین کو تربیت فراہم کرنے کے لئے مختلف قسم کی ریلیز، سیمینار منعقد کرنے ہوں گے۔ تاکہ کم از کم نئی آنے والی نسل کی صحیح انداز سے تربیت کی جاسکے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہمیں اس وقت کے ملکی حالات سے سبق سیکھنا ہوگا۔ بجائے مایوسی کے اور گھبرانے کے اور وطن عزیز کو مزید تباہی اور بربادی سے بچانے اور ملک کا مستقبل محفوظ بنانے کے لئے عملی میدان میں آنا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا
تندئی باد ہوا سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لئے

ہمیں اپنی ضروریات کو محدود کرنا ہوگا اور ملکی حالات کے پیش نظر ہمیں ''کم'' پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جب ہم اپنے مطالبات کو بڑھائیں گے تو حکمرانوں کو اپنی کرسی بچانے کے لئے ہماری ضرورتیں پوری کریں گے۔ چاہے وہ کسی غلط طریقہ سے ہوں، کسی ملک کے سامنے ہاتھ پھیلا کر، ملکی خودمختاری کو پاش پاش کر کے۔

عشق قاتل سے بھی ، مقتول سے ہمدردی بھی
یہ بتا کس سے محبت کی جزا مانگے گا
سجدہ خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عقیدت کا صلہ مانگے گا

اخلاص کی بستی میں جا کہ تو دیکھو

حدید اللہ (اول، تحریری مقابلہ)
13-SE-80

یہ دنیا اک عجب کھیل تماشا ہے۔ نہ کوئی دیکھنے، نہ کوئی سننے والا ہے، نہ تھامنے والا اور نہ ہی کوئی سہارا دینے والا ہے۔ ہر ایک شخص دوسرے کو پستی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں ہر ایک شخص نرالا اور اپنے گن گانے والا ہے۔ ایک وہ دور تھا جب اس دنیا میں ہر ایک شخص اس کے اعلیٰ اخلاق و گفتار کی بدولت اس دنیا میں اپنی عظمت کے جھنڈے لہرا کر اپنی اور اپنی سات پشتوں کا نام سنہرے حروف میں رقم کر جاتا تھا۔ مگر افسوس وہ لوگ بھی مٹ گئے اور ان کے کارنامے اور ان کے اسباق بھی ان کے ساتھ مٹی کے خاموش ذروں میں درگور کر دیئے گئے۔ آج کے اس مادیت پرستی کے دور میں جہاں محض نوٹوں اور نوٹ والوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہاں ہی ایک ایسی دنیا بھی بستی ہے جس نے اپنی زندگی اپنا پیٹ چاک کر کے گزاری ہے اور گزار رہے ہیں، عجب بات ہے تاریخ میں ایسے لوگوں کا نام کہیں نہیں ملتا۔ جنھوں نے کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے گھسے ہوئے ہاتھوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے باوجود اعلیٰ کردار اور اخلاق کو اپنے ظرف کا حصہ بنایا یہ لوگ بظاہر تو غیرت کے ہاتھوں مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ اپنے اندر اتنے بڑے دل رکھتے ہیں کہ گویا ان کو موقع ملے تو وہ پورے جہاں کو اپنے دل میں سمیٹ لیں۔ یہ لوگ کسی امیر کے آگے ہاتھ پھیلانے سے زیادہ فاقہ کشی کو فوقیت دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ضمیر انہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر گوارہ نہیں کرتا۔

خاموشی ہے بنجر زمین کے دانوں میں
چلنے سے ان کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں

اخلاص کا لفظ ان کے مترادف ہے جسم کی بھوک انہیں تڑپاتی ہے۔ مگر ضمیر کی تسلی انہیں سکون میسر کرتی ہے کہ ان کے اندر ان نازک اور کمزور لوگوں سے زیادہ قوت مدافعت آتی ہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک کسی انمول ہیرے اور انمول جواہرات سے کم نہیں۔ ہمارے اعلیٰ لباس اور اونچی ناک کے حامل لوگ جنہیں اپنی شاہی سواری سے بھی اترنے کی فرصت زیب نہیں ہوتی۔ انہیں کیا معلوم کہ جب بنا بستر کے سردیوں کی راتوں میں سونا پڑے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ جب کسی چیز کے کمی چاہت کے باوجود اس کو دور سے بھی دیکھ نہ پانا، دل کو چیر کر رکھ دیتا ہے، گوشہ گوشہ سسکیاں لیتا ہے، مگر انہیں کیا معلوم کہ یہ کیسا لگتا ہے۔

کیا تمہیں معلوم ہے لفظِ غربت کا
کبھی آؤ ! تمہیں یہ منظر بھی دکھادیں

یہ امیر لوگوں کے بلند و بالا بے جاں مکان جنہیں انہوں نے دوسروں کے حق سے چھین کر بنایا ہے، محض بے رونق کھنڈر ہے۔ مگر ایک سفید پوش شخص جس نے اپنے خوں پسینے کی کمائی کو جوڑ جوڑ کر محض ایک کمرہ بنایا ہے۔ مگر اس کے لئے یہ کمرہ کسی جنت سے کم نہیں۔

ان لوگوں میں جا کر دیکھو تو معلوم ہو جائے کہ ایک عام شخص کی طرح یہ بھی ہزار خواہشیں رکھتے ہیں۔ مگر انتھک کوششوں کے باوجود بھی ان کی امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ مگر وہ پھر کوشش جاری رکھتے ہیں۔ بالکل اُس مکڑی کی طرح جو اپنے جال سے گر گئی اور بہت کوششوں کے باوجود وہ اس جال تک نہیں پہنچ سکتی۔ مگر وہ ہمت

نہیں ہارتی اور اپنی منزل مقصود کو پا ہی لیتی ہے۔

کبھی ان ماؤں کو جا کر دیکھوں جن کا لختِ جگر اس کے سامنے بھوک پیاس سے تڑپ رہا ہوتا ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں محض اس کو اپنے دامن میں چھپانے کے لئے اس کا بس چلے تو دنیا کی ہر ایک شے اپنے لختِ جگر کی گود میں ڈال دے تا کہ اُس کو تسکین مل سکے۔ مگر غربت اُسے مجبور کرتی ہے فاقہ کشی کرنے اور یہ سب کچھ اس کی روح کو چھلنی کر دیتا ہے اور اس ماں کا دل اپنے لختِ جگر کے لئے خون کے آنسو روتا ہے۔ مگر ان مخملی لوگوں کو کیا معلوم بھوک کیا ہے، فاقہ کشی اور تڑپ تڑپ کر جینا کیا ہے۔ یہ تو بس اپنی دھن میں مگن نرم و گداز بستروں میں بیٹھ کر سکون لینے کے عادی ہیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو کہ چند قدم پیدل چلنا گوارا نہیں کرتے اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ غربت کے مارے لوگوں کی زندگی جستجو اور جدوجہد کے ملے جلے تاثر سے گزر جاتی ہے۔ کچھ پانے کی چاہت' کچھ حاصل کرنے کی جدوجہد ان کی زندگی کا اثاثہ ہے۔ ان کی زندگی تاریکی سے شروع ہوتی ہے اور تاریکی میں ختم ہو جاتی ہے۔ مگر وہ بذاتِ خود تاریک نہیں ہوتے۔ یہ زمانے کی خلشیں اور تلخی ہے جو انہیں زندگی کے اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے جہاں خاموشی اور سکون کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

کبھی انہیں آ کر دیکھو انہیں جانو اے لوگو! کیونکہ درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو کہ اس دنیا میں سے جہالت کا اندھیرا اپنی درخشندہ آنکھوں کی چمک سے ختم کر سکتے ہیں۔ صحیح معنوں میں یہی وہ لوگ ہیں جو مٹی سے بنے، مٹی میں رہے اور مٹی میں ہی جا ملے نہ کہ ان لوگوں کی طرح جو کہ بنے تو مٹی سے مگر وہ اس حقیقت کو بھول گئے اور اسی مٹی کو اپنے لئے نجاست کا باعث سمجھتے ہیں اور مٹی میں دفن بھی ہونا نہیں چاہتے۔ اگر کبھی اخلاص کی پستی میں جا کر دیکھو تو اس بات کا احساس ہوگا کہ کمل کے پھول کیچڑ میں ہی کھلتے ہیں۔ گو وہ بہت گندی جگہ پر پلتے ہیں' نشو و نما پاتے ہیں۔ مگر وہ بذات خود غلط اور گندے نہیں ہوتے بلکہ سارا زمانہ ان کی خوبصورتی کے گیت گاتا ہے۔

ماضی میں جھانک کر دیکھوں اس حقیقت سے آشنائی ملتی ہے کہ تبدیلی کبھی بھی اونچے ایوانوں یا بڑے بڑے محلوں یا پھر اونچے لوگوں کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ یہ تبدیلی لانے کوئی اور نہیں بلکہ مٹی میں رہنے والے' بھوک کی سختی برداشت کرنے والے وہی لوگ ہیں۔ جنہوں نے زمانے میں تبدیلی لانے کے لئے کوئی رقم نہیں لٹائی بلکہ محض اپنے دل کی آواز سنی اور ایک ولولہ انگیز جوش و جذبہ سے محنت کی اور دنیا کے تاریک ماضی کو سنہرے مستقبل کی طرف گامزن کیا۔

یہ لوگ سادگی سے زندگی گزار کر اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں گو کہ ان کے پاس نہ ہی مال و دولت کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں، نہ ہی ہیرے جواہرات کے صندوق پڑے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس محض ایک زندہ ضمیر ہوتا ہے جو کہ ازل اور ابد میں ان کے لئے اصل تسکین کا باعث بنتا ہے۔

جائے گا جب یہاں سے نہ کچھ تیرے پاس ہوگا
دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہوگا

اگر کبھی ان کی رہائش اور ان کے علاقوں کو دیکھوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جنگ کے بعد کھنڈر جگہوں میں زخمی لوگ رہ رہے ہوں۔ جنہوں نے اپنی محنت اور عظمت کے جھنڈے جنگ میں

لہرائے۔مگر کسی بے کار چیز کی طرح چھوڑ دیا گیا۔اوران کی عظمتوں کو بھلا دیا گیا۔ انہوں نے اپنے بارے میں کبھی نہ سوچا بلکہ دوسروں کے بھلے کو دل میں جگہ دی۔مگر انہیں تخت پہ بٹھانے کے بجائے زمین کی پستی میں جگہ دی۔

بچے جو کہ مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔مگر درحقیقت غریب کے بچے کسی حال کے نہیں ہوتے ۔ انہیں بس زمانے کی تلخیوں کو برداشت کرنے کے لئے بے رُخی اور تنگ دلی کے صحرا میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں زمانے کے سخت اور بے رحم جھونکے نہ صرف ان کے جسموں کو چھلنی کرتے ہیں ۔ بلکہ ان کے مستقبل کو تاریکی میں دفن کر دیتے ہیں۔مگران سب چیزوں کی فکر کسی کو نہیں ، انہیں بھی نہیں جو بظاہر مساوات اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کے حامی ہوتے ہیں۔مگر اصل میں وہ غریب اور غربت کی مدد کرنے کی بجائے انہیں ایک ایسا ناصور سمجھتے ہیں ۔جنہیں جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک کر ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔مگر وہ لوگ اس بات سے نا آشنا ہیں کہ جب طاقت کے بل پر کسی چیز کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ باہر نکلتی کہ اس کی شدت ان دعوندے کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔

دبادیں ہم کو یہ کسی میں دم نہیں
رکھیں خاطر ! ہم کسی سے کم نہیں

سنہری باتیں

۱۸۔ کسی مسئلے پر بے لاگ اور موثق رائے وہی دے سکتا ہے جو کا اُس سے تعلق نہ ہو۔

۱۹۔ دماغ عجب شے ہے۔یہ ہمارے صبح سو کر اٹھنے کے بعد سے اُس وقت تک کام کرتا رہتا ہے۔جب تک کہ ہم آفس تک نہ پہنچ جائیں۔

۲۰۔ قوانین اچھی طرح سے سیکھو تا کہ تم پھر انہیں اچھی طرح سے توڑ سکو۔

۲۱۔ میرے دوست نے فکرمندی سے بتایا کہ اس کی بیوی اپنے آپ ہی سے باتیں کرتی رہتی ہے۔یہ کام میری بیوی کئی سالوں سے کرتی آرہی ہے۔وہ سمجھتی ہے میں اُسے سن رہا ہوں۔

۲۲۔ جو لوگ ابارشن کے حق میں ہیں۔حیرت ہے وہ خود کیسے پیدا ہوگئے۔

۲۳۔ غیر حاضر دماغی کی انتہا یہ ہے کہ آپ اپنے فون سے اپنا ہی نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

۲۴۔ ریل کے حادثے میں آپ کے دماغ کے حاضر ہونے سے زیادہ ضروری ہے کہ آپ کا جسم غیر حاضر ہو۔

۲۵۔ حادثات کی شرح بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کر کے کم کی جاسکتی ہے۔

۲۶۔ کبھی اداکاروں کی طرف پیٹھ نہ کرو۔یاد رکھو کہ لنکن کو مارنے والا ایک اداکار ہی تھا۔

اب تو مسلم کو مسلمان سے ڈر لگتا ہے

شاہد محمود (دوئم، پری رٹن تحریری مقابلہ)
10-ME-90

یہ ایک لمحہ فکریہ ہے کہ مسلمان بھی مسلمان سے محفوظ نہیں۔ اس کی وجہ ہماری مذہب سے دوری اور ایمان کی کمی ہے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد ہم اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن کامل مومن ہونے کے لئے صفاتِ ایمانی کو اپنے اندر پیدا کرنا پڑتا ہے۔ صفاتِ ایمانی وہ ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھیں اور اپنائی تھیں۔ ان صفات میں اچھے اخلاق سب سے بڑی چیز ہے۔ اچھے اخلاق کی وجہ سے غیر مسلم بھی اتنے زیادہ متاثر ہوتے تھے کہ ایمان میں داخل ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ مسلمان کا پہلا بول ہی السلام علیکم! ہے جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم نے اپنے مسلمان بھائی کو اس بات کی یقین دہانی کرادی کہ میری طرف سے آپکی جان کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عزت کی حفاظت اور سلامتی ہے۔ اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے بلکہ ہر کسی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے:

''ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے دن ظلم سے بہت سے اندھیرے ہونگے اور بدکلامی سے بچو اور لالچ سے بچو۔ کیونکہ تم سے پہلے لوگ لالچ کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اسلام کا کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان تمہاری زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ اُسی شخص نے یا دوسرے نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہجرت کی کونسی صورت افضل ہے؟ فرمایا کہ: تم ان کاموں کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو ناپسند ہیں۔''

مسلمان کو تکلیف پہنچانا تو دور اسلام تو ہمیں مسلمان کی کمی دیکھنے اور بیان کرنے سے بھی منع کرتا ہے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے ایک شخص اُٹھا اور اپنا جوتا بھول گیا۔ تو کسی نے مذاق کے طور پر جوتا چھپا دیا۔ اُس شخص نے واپس آ کر اپنے جوتے کا پوچھا تو لوگوں نے کہا ہمیں نہیں پتا۔ اور ان کو پتا بھی نہیں تھا۔ پھر جسے پتا تھا اُس نے واپس دے دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ اپنے مسلمان بھائی کو پریشان کرنے کا اللہ کے ہاں کیا جواب دو گے؟ اُس نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے تو مذاق کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ پھر یہی فرمایا کہ اللہ کے ہاں مسلمان بھائی کو پریشان کرنے کا کیا جواب دو گے؟

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے ایک شخص اُٹھا تو اس کے اُٹھنے میں ضعف تھا کسی نے کہا کہ اس کے اُٹھنے میں ضعف (کمزوری) تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اُٹھ جا میری مجلس سے تو نے قرآن کا مذاق اُڑایا ہے۔

آج ہم اس بات پر غور کریں کہ ہماری وجہ سے کسی کو کوئی پریشانی تو نہیں آئی اور کتنی جگہ ہم غیبت اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس بات کا واضح پتا چلے گا کہ مسلمان کا معاملہ ہی سارے کا سارا اسلامی تعلیمات کے برعکس ہے۔ آج ظلم کرنے والا بھی مسلمان اور مظلوم بھی مسلمان ہے۔ چوری کرنے والا بھی اور جس جگہ چوری کرے وہ بھی مسلمان، اپنے ہی عزیز اور دوست کی غیبت

کرنے والا بھی مسلمان ۔ ہمارے اس رویے نے اسلام کو بدنام کر دیا اور لوگوں کو ہمارے مذہب سے متنفر کر دیا ہے ۔اس وجہ سے لوگوں کا اسلام میں داخل ہونا کم ہو گیا ہے۔

مسلمان تھا تو سب کا خیر خواہ لیکن اسلام سے دوری اور دنیا کی محبت نے اسے خونخوار بنا دیا ہے۔ اور طرح طرح کے فسادات اور دھوکے بازی میں مبتلا کر دیا ہے۔جس وجہ سے یہ منظر بن گیا ہے کہ مسلمان کو مسلمان سے ڈر لگنے لگا ہے۔صحابہ رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانہ میں ایسا ماحول تھا کہ اگر مدینے میں (1000) مسلمان تھے تو نوسو ننانوے باقی ایک کے خیر خواہ تھے اور اس کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے اور ہر ایک باقی نوسو ننانوے کا خیر خواہ تھا۔

الغرض ہم آج بھی اس بات کو اور ان صفاتِ ایمانی کو اپنے اندر پیدا کر کے سارے عالم پر غلبہ اور اللہ کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔کام صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے بنتا ہے۔جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا' کردار کا غازی بن نہ سکا

تو آج ہمیں اس بات پر غور کرنا پڑے گا اور اپنے آباؤ اجداد کی زندگی کا مطالعہ کرنا پڑے گا کہ ان کی کامیابی کا راز کیا تھا۔اس بات کو شاعر مشرق نے یوں بیان کیا ہے۔

تجھے ابا سے اپنے نسبت ہو نہیں سکتی
تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارہ

تو ہم اگر اچھے اخلاق اور اچھے معاشرے کے فرد بن کر سارے عالم کے انسانوں کے پاس جائیں تو لوگ ہمارے گرویدہ بن جائیں۔

"اپنی مدد آپ"

حنہ علی 13-ME-13

اے طائر لاہوتی !اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آج امت مسلمہ کا حال ایک ایسے شیر کی مانند ہے جو کہنے کو تو جنگل کا بادشاہ ہے۔مگر اُس پر چاروں اطراف سے جنگلی جانوروں نے حملہ کر رکھا ہے۔کسی نے اُس کی ٹانگ قابو کی ہوئی ہے تو کسی نے اُس کی گردن دبوچ رکھی ہے اور وہ شیر چراغِ سحر کی مانند اپنی زندگی بچانے کی کشمکش میں ہے۔مگر اس کی تمام تر طاقت اور زور بیک وقت اتنے شکاریوں سے مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگل کا بادشاہ اس حال تک پہنچا کیسے؟ مسلم امت تو وہ امت ہے جو دنیا پر حکمرانی کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے تو پھر آج یہ زوال کا شکار کیوں ہے؟ دراصل امت مسلمہ اس زوال تک پہنچنے کی خود ذمہ دار ہے۔اس صورت حال کو مولانا الطاف حسین حالؔی نے یوں تحریر کیا:

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تیری قوم کا یہاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے زور زماں مِٹ رہا ہے

اس تحریر میں میں آپ کی توجہ مسلمانوں کی ایک بہت اہم کمزوری کی طرف کروانا چاہتی ہوں۔عرضیکہ مسلمان کی ایک بہت عظیم خوبی اس کی خودداری اور غیرت ہے۔یہ وہ صفت ہے جو انسان کو دوسروں کا محتاج ہونے کی بجائے خود اپنے لئے کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کو اپنی صلاحیتوں پر یقین کرنا سکھاتا ہے۔اس صفت کی بدولت انسان کا مقام دوسروں کی نظروں میں بلند ہوتا ہے اور وہ دوسروں کی غلامی کی بجائے ایک باوقار شخص کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔آج مسلم امت کے زوال کی ایک بڑی وجہ اسی جذبے کی انتہائی شدید کمی ہے۔اسی جذبے کو اپنے اندر پیدا کرنے کی تلقین اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے۔ جو آج میری تحریر کا موضوع ہے۔اسی کا سبق ہمیں اسلام نے دیا ہے۔مگر افسوس اس بات کا ہے کہ آج ہم اس سبق کو تقریباً مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان انتہائی غیرت مند تھے اور یہی ان کے عروج کی اصل وجہ تھی۔اقبالؒ نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے لئے لکھا تھا۔

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

یہ سب دراصل اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآ وسلم نے فرمایا کہ

''لا تساء لو الناس شیاءً ''

ترجمہ: یعنی لوگوں سے کچھ نہ مانگو۔

اس ارشاد کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حالت ہوئی کہ کبھی سوار کے ہاتھ سے کوڑا بھی گر جاتا تو وہ اس خیال سے راہ چلتے سے نہ مانگتا کہ یہ سوال میں نہ آجائے۔ حضرت عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر تم لوگ جانو کہ سوال کرنے کے کیا نتائج ہیں تو کوئی شخص سوال کرنے کے لئے کسی دوسرے شخص کی طرف رخ نہ کرے۔''

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو محنت سے رزق حلال کمانے کی تلقین کی ہے حدیث قدسی ہے۔

''الکاسب حبیب اللہ''

ترجمہ: یعنی محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے

علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری قرآن پاک اور اس کی تعلیمات کی تفسیر ہے۔ مندرجہ بالا تمام تعلیمات کو اقبالؒ نے اپنے اس خوبصورت شعر میں سمو دیا ہے۔

اے طائر لاہوتی !اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ایک سچا مسلمان بھوکا مرنا پسند کرتا ہے۔ مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا ہے۔ اسے دنیاوی جاہ وجلال اور مال و دولت سے کچھ غرض نہیں ہوتا۔

تمام امت مسلمہ مل کر کشمیر کو فتح کر سکتی ہے۔ ہم پھر سے قبلہ اول میں آزادی کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ہم برما، بھارت اور تمام ممالک جہاں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ اس کو روک سکتے ہیں۔ کابل پھر سے مرکزی ایشیاء کا پُرسی بن سکتا ہے۔ شام، لیبیا اور مصر میں لگائی ہوئی آگ کو بجھایا جا سکتا ہے۔ مسلمان اپنے فیصلے واشنگٹن ڈی سی کی بجائے مکہ میں بغیر کسی دباؤ کے کر سکتا ہے۔ ہم اپنے پیارے پاکستان کو دنیا کی عظیم ریاست بنا سکتے ہیں۔ اسی کے دشمنوں کا جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے اندر خودداری کا وہ عظیم جذبہ پیدا کر لیں۔ جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں تھا۔ اگر ہم خودداری اور غیرت کے جذبے سے سرشار مسلمان بن جائیں۔ اگر ہم اپنا کام خود کرنا سیکھ لیں، اگر ہم دوسروں کے حق پر قبضہ کرنا چھوڑ دیں۔ آیئے پھر آج سے ہی ہم اس بات کا عہد کر لیں کہ ہم مر تو جائیں گے مگر کبھی بھی اپنی غیرت اور خودداری کے فلسفے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں گے اور اس کا آغاز ہم نے اپنی ذات سے کرنا ہے۔ بقول اقبالؒ:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

محمد سہیل 11-CP-127

مصرعہ اقبالؒ کا مطلب کچھ اس طرح بنتا ہے کہ نظام حکومت سے اگر دین کو خارج کر دیا جائے تو ظلم و بربریت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ مکمل شعر یوں ہے:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبالؒ اسلامی تعلیمات کے ایک ذہین اور بالغ نظر قاری ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق کا کوئی تصور موجود نہیں بلکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسے وہ یوں رقم طراز ہیں اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد تین ستونوں پر کھڑی ہے۔ توحید، رسالت اور خلافت۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا واحد مقصد انسان کی دنیاوی زندگی کو اس طرح سے سنوارنا ہے کہ کہیں کسی پر ظلم و زیادتی نہ ہو۔ ہر ایک کو جینے کے یکساں مواقع میسر ہوں۔ نہ کوئی ظالم ہو اور نہ مظلوم، نہ قاتل نہ مقتول بلکہ ہر شخص احترام انسانیت کا قائل ہو۔ ایسا اُسی وقت ممکن ہوسکتا ہے۔ جب حضرت انسان کسی قادرِ مطلق ہستی کا تابع ہو جائے اور اُسی کے سامنے اپنے تمام اعمال کی جوابدہی کا قائل ہو۔

اسلامی نظام حیات کا بنیادی تصور یہی ہے کہ حاکمِ اعلیٰ صرف اور صرف خدا تعالی کی ذات ہے۔ دنیوی اعمال کی جواب دہی کا خوف انسان کو دنیا میں بے لگام نہیں ہونے دیتا اور وہ سیدھے راستے پر گامزن رہ کر انسانی فلاح کے کام سرانجام دیتا ہے۔ یہ خوف ہر ایک کو چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، حاکم ہو یا محکوم سب کو دنیاوی معاملات میں صداقت و امانت، عدل و انصاف، مروت و ہمدردی، نیکی اور پاکبازی کی طرف مائل رکھتا ہے۔ اگر دین کو جو اسی تصورِ حاکمیت کا نمائندہ ہے۔ سیاست سے الگ کر دیا جائے تو صاحبانِ اقتدار اپنی ناواجب تمناؤں کی تکمیل کے لئے بے لگام ہو جائیں گے اور ایسے ایسے ظلم ایجاد کر لیں گے جس سے انسانی زندگی جہنم زار بن جائے گی۔ بقولِ اقبالؒ

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

فرنگی حکمرانوں نے جب خود کو مذہب کے سامنے بے بس پایا اور ہوس کی تکمیل میں رکاوٹیں محسوس کیں تو انہوں نے دین و دنیا کی علیحدگی کا شیطانی نظریہ گھڑ لیا۔ انہوں نے دین کو خدا اور بندے کا ذاتی اور انفرادی معاملہ قرار دیکر معاملاتِ حکومت سے الگ تھلگ کر دیا۔ ہوس کا رطبائع رکھنے والوں پر اس نظریہ نے جادو کا سا اثر کیا جلد ہی دنیا اس بھیانک نظریے کی لپیٹ میں آ گئی اس شیطانی تصور نے دنیا میں ظلم و بربریت، بے انصافی دوسروں کے حقوق کی

پامالی اورانسان کشی کے وہ کرشمے دکھائے کہ دنیا بلبلا اُٹھی۔ ہر طرف لہو کے سمندر موجیں مارنے لگے۔ اور ہر کہیں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ صاحبانِ اقتدار انسانی جانوں سے خون کی ہولی کھیلنے لگے یہ طوفانِ بدتمیزی جدھر کا رخ کرتا گیا انسانوں کو حشرات الارض کی طرح پیروں تلے روندتا چلا گیا۔ اور قرطاسِ عالم پر ایسی ایسی خوفناک تحریریں اپنی یادگار چھوڑیں کہ آج بھی انسانی دل دہلنے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ ظلم و بربریت، بے حیائی و مکاری، خودغرضی و مفاد پرستی کے چنگل سے آزادی کا ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ کہ دین کے عطا کردہ ضابطہ اخلاق کو اپنایا جائے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ عالمِ انسانی کو وہ بصیرت عطا کرے کہ وہ دین کی پہچان کرتے ہوئے دین اور سیاست کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم سمجھیں۔

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دین ہمہ اُوست
اگر بہ او نہ رسیری تمام بولہبی اَست

سنہری باتیں

۲۷۔ لڑکپن ایک ایسی عمر ہے کہ اگر آپ اُسے جوانی نہ سمجھیں تو وہ بچپن بن کر سامنے آتا ہے۔

۲۸۔ بہت سے ایسے علاج ہیں جو بیماری کو دور نہیں کر سکتے۔ اُن میں سے ایک مفت مشورہ بھی ہے۔

۲۹۔ بے عزتی سے بچنے کے لئے اپنے آپ سے کام رکھو اور کبھی کسی کو مشورہ نہ دو۔

۳۰۔ جو لوگ دوسروں کو نصیحتیں کرتے رہتے ہیں، عام طور پر ان کے سب سے زیادہ محتاج وہ خود ہوتے ہیں۔

۳۱۔ اُن لوگوں کی ذہانت کی داد دینی چاہیے، جو دوسروں سے مشورہ مانگتے ہیں۔

۳۲۔ بچوں کو نصیحت کرنے کا بہترین زمانہ وہ ہے جب وہ آپ کی باتوں کو سچا مان لیتے ہیں۔

۳۳۔ صحت مند لوگوں میں ایک بیماری عام ہے، یہ لوگ ہمیشہ بیماروں کو نصیحت کرتے ہیں۔

۳۴۔ میرے خیال میں عقلمندی حریدنے کے لئے پوری زندگی بہت زیادہ قیمت ہے۔

۳۵۔ عمر بھی دھوکہ دے جاتی ہے انسان چالیس سے پچاس سال کا اتنی جلدی نہیں ہوتا، جتنی جلدی پچاس سے ساٹھ سال کا ہو جاتا ہے۔

جو ہو ذوقِ یقین پیدہ

غلام مرتضیٰ 11-CE-187

آزادی اللہ تعالیٰ کی ان بیش بہا نعمتوں میں سے ایک ہے جس کے لیئے بڑی بڑی شخصیات نے اپنے تن من اور دھن کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ آزادی کو پانے اور غُلامی جیسی ذِلت سے چُھٹکارا حاصل کرنے کے لیئے اپنے سر کو تن سے جُدا کروا بیٹھے۔ لیکن غُلامی کے طُوق کو بھی اپنے گلے کا مقدر نہ بننے دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے مخالف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور کبھی بھی غُلامی کو قبول نہ کیا۔

؎ یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہادِ زِندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اصحاب رسول ﷺ کی غزوہ بدر میں مشرکینِ مکہ کے خلاف یلغار ہو یا محمد بن قاسم کی راجہ داہر کے خلاف للکار، صلاح الدین ایوبی کی عیسائیوں کے خلاف اُٹھتی ہوئی تلوار ہو یا سلطان ٹیپو کی فرنگیوں کے خلاف صدائے گرجدار، شاہ ولی اللہ کی مرہٹوں کے خلاف بلند ہوتی ہوئی پُکار ہو یا مشرکین ایران کی جانب بڑھتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ہتھیار: **سب میں ایک ہی چیز مشترک نظر آئی اور وہ ہے، ''ذوقِ یقین''۔**

انسان کو جب اپنی قابلیت پر بھروسہ اور اعتماد ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے پائے عزیمت میں لغزش برپا نہیں کر سکتی بلکہ وہ تو اپنی عقابی روح میں محو پرواز، اپنی ہمت و استقامت پر سرشار، عیش پرستی اور سُستی و کاہلی سے بیزار اور خوابِ غفلت سے مسلسل بیدار ہو کر اپنی منزل کی جُستجو میں مگن رِہتا ہے اور اَن گِنت مصائب و آلام کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

بقول اقبال:

؎ عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے صرف ایک ہی آلہ کار آمد ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے ''ذوقِ یقین''، جسکا مطلب ہے مُشکلات کا سامنا کرتے وقت اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونا بلکہ اپنی قابلیت و اہلیت پر یقینِ کامِل رکھتے ہوئے مسلسل آزمائش و تکالیف کے خلاف برسرِ پیکار رہنا۔

''ذوقِ یقین'' ہی وہ ہتھیار ہے جس کی بدولت مسلمانوں نے چار دانگ عالم میں اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑھ دیئے، انہوں نے کبھی شہنشاہ اندلس کے غرور و تکبر کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تو کبھی ایرنیوں کی مشرکانہ روش کو تخت و تاراج کر کے رکھ ڈالا۔ کبھی مصر کے حکمرانوں کو ان کی بدعہدی و بدنیتی کا مزہ چکھایا، تو کبھی سپین کے بادشاہ کے ظلم و بربریت کو خاک میں ملا ڈالا، کبھی کفارِ مکہ کی منافقت کو غزوہ بدر میں کُچل ڈالا، تو کبھی ۱۹۶۵ء میں ہندو کی مکاری و چالاکی کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ ان تمام فتوحات کے دوران صرف ایک ہی جوہر ''ذوقِ یقین'' مسلمانوں کے کام آیا۔ انہوں نے کبھی جنگ کے دوران تعداد یا اسلحے کو مدِ نظر نہ رکھا بلکہ ہمیشہ اپنے خالقِ حقیقی پر بھروسہ کرتے ہوئے ٹڈی دل لشکروں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ ایک ایسی دیوار جس سے ظلم و بربریت کا ہر طوفان ٹکرا کر محض اپنا ہی سر تُڑوا بیٹھا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلیئے پستی و زوال کی عمیق گہرائیوں میں جا ڈوبا۔

کون کہتا ہے کہ پتھر نہیں روتے؟

حفصہ انعم 11-TE-162

آخر پتھر روتا کیوں ہے ؟ کیا غم ہے پتھر کو کہ اسے رونا پڑتا ہے؟ یہ صرف وہ جان سکتا ہے جس کے جذبات زندہ ہوں ۔۔۔

پتھر روتا ہے تو اپنی تنہائی کی وجہ سے ، تب تنہا پتھر ایسے روتا ہے کہ چشمے پھوٹ پڑتے ہیں ، اور پھر اس کے اندر ایسا آتش فِشاں پھٹتا ہے کہ وہ خود کوئلہ ہو جاتا ہے اور پھر راستے میں آنے والی ہر شے کو راکھ کردیتا۔۔

وہ مضبوط چٹان کی مانند ہوتے ہیں ، حالات جیسے بھی ہوں ، وہ خود پر آنسوؤں کو حاوی ہونے نہیں دیتے ۔ چُپ چاپ ، خاموش سارے درد سہتے ہیں، لیکن پھر اِسکا انجام کیا ہوتا ہے، بس یہ کہ کوئی ہنستا مُسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لیئے اُداس اور خاموش سا ہو جاتا ہے۔جو کبھی دُنیا کو ہنساتا تھا ، وہ خود کی خاموشی میں ڈوب جاتا ہے۔جِسکو تنہائی سے نفرت تھی ، تنہا شامیں گزارنا اسکا مقدر بن جاتا ہے۔رات کی تاریکیوں میں جاگنا اچھا لگتا ہے اسکو،جاگنا کیا ، نیندیں ہی کہیں کھو جاتی ہیں۔۔۔

لیکن یہ ہی مضبوط چٹان ، جب اِنکی خاموشی تنہائی کو برداشت نہیں کر پاتی تو ان سے بےبسی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے، وہ آنسو بےبسی کے آنسو ، وہ محض پانی نہیں بلکہ انسان کی بےبسی ، اسکے جذبات ، اسکی تنہائی اور کھوئے ہوئے لمحات کا عکس ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے لیئے تو محض آنسو ہوتے ہیں لیکن اس کے لیئے قیمتی موتی، وہ ہی سرمایا ہوتے اسکے۔ تب انسان کا دِل چاہتا ہے کہ وہ تنہائی میں زاروقِطار روتا جائے اور بس روتا ہی جائے۔

صرف وہ پتھر روتے ہیں جِن کے جذبات زِندہ ہوتے ہیں، جو ہر چیز کو محسوس کر سکتے ہیں۔اس کے برعکس ، وہ لوگ تو شاید آنسوؤں کا مطلب بھی نہیں جانتے جِنکے جذبات مَر چُکے ہوتے ہیں۔

بہت مضبوط چٹانوں کو آنسو بہاتے دیکھا، ایسی چٹانیں جو دُنیا کے سامنے تو بہت مضبوط معلوم ہوتی ہیں لیکن اندر سے ان کے جذبات، ان کی تنہائی، ان کو کھوکھلہ کر رہی ہوتی،ان کو راتوں کو جاگنے پر مجبور کرتی ہے۔

بہت پتھر روتے دیکھے، بہت مضبوط چٹانوں کو ٹوٹتے دیکھا، بےبسی کے لمحات، نااُمیدی کے سمندر میں یہ قیمتی پتھر ڈوبتے دیکھے۔لیکن یہ دُنیا رواں دواں ہے، کوئی جانتا تک نہیں ، شاید کوئی جاننا چاہتا ہی نہیں۔

افسانہ

قبرستان سا عالم
شہباز کھوسہ
39

بے غیرت حکمران
الطاف حسین سیوڑا
41

انسانوں کی پہچان
مستبشرہ فاروق
42

سستہ دام
محمد شہزاد
45

کچھ لوگ سمندروں سے بھی گہرے ہوں جس طرح
اُمِّ ھانی
51

احساس کے رشتے
اُمِّ ھانی
55

قبرستان سا عالم

شہباز کھوسہ
11-ME-22

میں ایک لاش ہوں، تعفن زدہ، گلی سڑی ایک بدبودار اب سے ٹھیک چھتیس گھنٹے پہلے میں ایک زندہ جیتا جاگتا انسان تھا، اب بلدیہ ڈیرہ غازی خان کا عملہ مجھے بے دردی سے اُٹھا کر ٹرک میں پھینک رہا ہے۔ میں دکھ تکلیف حتیٰ کہ رنج وغم سے آزاد ہو چکا ہوں۔ مجھے ان کی جانب سے اتنی بے رحمی سے ٹرک میں پھینکنے پر تکلیف محسوس ہو رہی ہے نہ دکھ۔۔۔ مجھ سے نفرت کی جاسکتی ہے۔ میں ایک نشئی ہوں اور میری موت بھی نشہ کی زیادتی سے ہوئی ہے ۔ جب میں پیدا ہوا تھا۔ میرے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ پاکستان کی موجودہ بے روزگاری کی فضا میں لڑکی کا پیدا ہونا اتنی خوشی کی بات نہیں سمجھا جاتا۔ جتنا ایک لڑکے کا، میں لڑکا تھا۔ میری ماں پھولے نہیں سما رہی تھی۔ بیٹا جو ہوا تھا اور میرے باپ کا چہرہ تو دیکھنے والا تھا۔ خوشی سے ٹمٹماتا ہوا چہرہ، فخر سے پھولا سینہ لئے ہوئے وہ مبارکبادیں وصول کرتا رہا۔ میٹھایاں بھی بٹیں۔ میں اپنے باپ کی دل کی دھڑکن سن سکتا تھا۔ ایک مطمئن دھڑکن جیسے کہہ رہی ہو میرے بڑھاپے کا سہارا پیدا ہوگیا ہے، میرا بازو پیدا ہوگیا ہے۔ نشے کا سفر سگریٹ سے شروع ہوا پھر چرس، ہیروئن اور آخر میں نشے کے انجکشن تک جا پہنچا۔

میں ڈیرہ غازی خان شہر آ گیا، محنت مزدوری سے اتنے پیسے کہاں ملتے کہ گھر بھی بھیج پاتا۔ جو ملتا میں کھا لیتا اور رات کو انجکشن لگا لیتا۔ غازی صاحب کے دربار کے ہر طرف اور غازی پارک میں مجھ جیسے سینکڑوں مردے یہی کرتے ہیں۔ ایک دن نقاہت کا اتنا شدید جھٹکا لگا کہ میں غازی صاحب کے مزار کے سامنے کے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ بس میرا گرنا تھا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ فٹ پاتھ پر میں سردی سے ایڑیاں رگڑتا رہا۔ میرا جسم نیلا پڑ گیا، میں لحہ لحہ موت کی جانب بڑھنے لگا، اب میں تھا اور میری موت۔۔۔ پھر ایسا ہوا میرا جسم، سردی، درد، بھوک پیاس سے عاری ہو چکا تھا۔ مزار پر آنے والے زائرین کے ولولہ انگیز نعروں اور ڈھول کی تھاپ مجھے احساس دیتی ابھی میں زندہ ہوں۔ مرا نہیں۔۔۔ کئی دن کے فاقے اور سرد ہواؤں کے تھپیڑوں نے مجھے تھپک تھپک کر موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ میں مر گیا، آخر کتنے دن میں اتنے ہجوم میں تنہا موت کا انتظار کرتا۔ غنودگی میں کبھی مجھے محسوس ہوتا میری ماں پکار رہی ہے ''میڈا پتر آونج، تیکوں سردی لگدی پئی اے، آجا میڈا پتر آجا، میڈا چندر دا ٹکڑا آجا، ہن توں'' مرے انسان کی تو مسکراہٹ ہی حسین ہوتی ہے۔ زندگی سے بھرپور۔۔۔ کبھی مجھے میرا باپ آوازیں دیتا سنائی دیتا، ''اوئے کھوتا کہتا تھا نہ کہ ڈی جی خان نہ جاویں، چل ہن میڈی چھاتی نوں لگ جا'' مرتے مرتے مجھے سب یاد آیا تھا۔ میری بہن جو مجھے کہا کرتی تھی۔ ''ویرا دیکھنا تیری شادی پر باگ پھڑائی ڈھیر ساری لوں گی''، میں مسکرا کر کہتا اس سے پہلے میں نے تیری ڈولی رخصت کرنی ہے۔ اندر سے وہ سر پر دوپٹہ رکھ کر نظریں نیچے کر لیتی۔ معلوم نہیں کہاں ہوگی، کیسے ہوگی، وہ تو میری منتظر ہوگی۔ اب تو میں نہیں آسکوں گا۔ میں غازی کی نگری میں پھلاں دا شہر ڈیرہ غازی خان کے شہر میں تنہا بھوکا پیاسا چپ چاپ مر گیا۔ اس عبرت ناک موت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں نے نشہ شروع کیا اور پھر کرتا چلا گیا۔ اتنا نشہ کیا کہ پھر زندگی میں کچھ اور نہ کر سکا۔ جنہوں نے مجھے نشہ پر لگایا، قانون اور انصاف پر مبنی معاشرے میں چرس،

ہیروئن بیچ کر مجھ جیسے لاکھوں نوجوانوں کو ناکارہ کیا۔ مرنے پر مجبور کیا، مار دیا۔ وہ سب معاشرے کے ستون ہیں۔ ان معززین سے ہی تو معاشرے کا حسن ہے، عدالتوں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کی موجودگی میں نہایت اطمینان اور محفوظ طریقے سے ہم جیسوں کو نشے کی ترسیل دیتے ہیں اور پھر مقدس مقامات پر پانی کے کولر، صفیں اور چادریں رکھ کر نیک اور پرہیز گاروں میں اپنا شمار کراتے ہیں۔ جب میں مر گیا تو چھتیس گھنٹے تک میری لاش بے گور و کفن فٹ پاتھ پر پڑی رہی۔ میرے قریب سے سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ گزرتے رہے۔ قہقہے لگاتے، ٹھڈے لگاتے کسی نے اتنی زحمت نہ کی کہ وہ مجھے دیکھ لیتا کہ ایک انسان فٹ پاتھ پر کافی دیر سے مرا پڑا ہے۔ اتنے بڑے ولی اللہ کے مزار پر چادریں چڑھتی رہیں، نیازیں بٹتی رہیں، دھمالیں پڑتی رہیں۔۔۔۔ لوگوں کے اس ہجوم میں فقط ایک انسان کا منتظر رہا۔ لیکن شاید مسیحا، انسانیت، احساس اور آدمیت کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ مجھ جیسے سیاہ بختوں کی جانب توجہ دی جائے۔

میں مر چکا، اب پولیس میری تدفین کرے گی۔ مجھے نامعلوم اور لاوارث قرار دے کر دفنا دیا جائے گا۔ قصہ ختم، لیکن اگر آپ میں ہمت ہے تو ایک بار اس کفن کو سرکا کر میرا چہرہ دیکھیں، غور سے دیکھیں، یہ میں نہیں شرافت کا جنازہ ہے۔ دیکھیں یہ ایک نامعلوم انسان کی لاش نہیں اس معاشرے کی لاش ہے۔ معاشرہ جو میری طرح گل سڑ چکا ہے۔ جسے نشہ دیمک کی طرح چاٹے جا رہا ہے۔ جو مجھ سے کہیں زیادہ تعفن کا ذخیرہ رکھتا ہے۔

میرا چہرہ جسے اپنی ذات میں گم رہنے کی خواہش نے بگاڑ کر اس حد تک بدصورت بنا دیا ہے کہ دنیا اسے نفرت سے دیکھتی ہے۔ میری شکل میں آپ کو لاکھوں بے بسوں کی موت نظر آئے گی۔ جو فٹ پاتھ، گٹروں، سنسان پارکوں، اندھیری گلیوں، کچرہ کنڈیوں میں ایڑیاں رگڑتے مر رہے ہیں۔ میرے چہرے پر وہ چہرے تلاش کریں جو اس ملک کو ہیروئن کی شکل میں موت دے کر بھی معزز ہیں۔ میں تو مر چکا، کاش نفسانفسی، خودغرضی، آگے نکل جانے کی حرص میں مبتلا لوگوں کے حلقوم سے نکلی زبانوں کے ساتھ وحشیوں کی طرح بھاگتے کسی کی نظر ہم لوگوں پر پڑ جائے۔ میں ایک نامعلوم اور لاپتہ لاش نہیں، میں اکیلا اپنی موت کا ذمہ دار نہیں میرے قاتل آپ بھی ہیں اور آپ کا مصنوعی اور خوبصورت معاشرہ بھی۔

بے غیرت حکمران

الطاف حسین سیوڑا
12-CE-41

چاچا شیدا میرے گاؤں میں رہتا تھا۔غریب آدمی تھا، گھر میں اکثر فاقے رہتے تھے۔اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جو سارا دن پورے گاؤں میں آوارہ گردی کرتا۔ جب بھی کسی زمیندار کی گندم کی کٹائی کے لئے ونگار ہوتی یا مکانوں کی تعمیر ہوتی تو ہر زمیندار چاچا شیدا کو بلاتا تھا اور مفت میں اس سے کام نکلواتا تھا۔ گاؤں کے بڑے بڑے زمیندار ہر وقت شیدے کے لئے واہ واہ کرتے تھے۔آخر انہیں اپنے کام جونکلوانے ہوتے تھے۔

کچھ ہی دنوں میں شیدے کے دن پھر گئے۔اس کے بیٹے کا باہر کے ملک ویزہ لگ گیا۔اور پھر میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ امیر ہوگیا ۔اس نے ونگار اور دوسری تمام چیزوں کو خیر باد کہہ دیا۔ اب وہ نقدی روٹی کمانے کے لئے زمینداروں اور چوہدریوں کی خوشامد نہیں کرتا تھا۔گاؤں کے زمینداروں اور چوہدریوں کو شیدے کی یہ ترقی ایک آنکھ نہ بھائی۔ کیونکہ ان کو اپنا بیگار سسٹم ڈوبتا ہوا نظر آرہا تھا۔ سب پڑوسی رشتہ دار بھی مخالف ہوگئے۔نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اُس کے گھر والوں اور شیدے کے روز روز کی تُو تکار کے بعد جھگڑے ہونے لگے۔ شیدا ان جھگڑوں سے بچنے کے لئے گاؤں کے بڑے لوگوں اور زمینداروں سے انصاف مانگنے لگا۔لیکن کسی نے اس بے چارے کی ایک نہ سنی۔

مجھے شیدے کے ساتھ نا انصافی پر دلی افسوس تھا۔لیکن گاؤں کے زمینداروں، وڈیروں اور چوہدریوں کے سامنے کس کی چلتی ہے؟ آخر کار شیدا حالات سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑ کر کسی دوسرے گاؤں چلا گیا اور وہاں نیا مکان خرید لیا۔

بہت دنوں بعد دعوت کے سلسلے میں گاؤں کے سارے لوگ ہماری بیٹھک میں جمع ہوئے۔لوگوں میں مختلف باتوں پر تبصرے ہونے لگے۔ میں اور میرا دوست بھی وہاں تھے۔ہم نے شیدے کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کا ایک دوسرے سے تذکرہ کیا اور افسوس بھی کیا۔باتوں ہی باتوں میں گاؤں کے بڑے زمیندار نے بولنا شروع کیا۔سب لوگ اس کی بات سننے کے لئے چپ ہوگئے۔ کیونکہ اس کا خاصا رُعب تھا۔وہ کچھ ان الفاظ میں گویا ہوا:

''بھائیو! ملک میں بڑی نا انصافی ہے ہر طرف رشوت، حرام خوری عام ہے۔ ہر محکمہ کریک (Crack) ہے۔ دہشت گردی زوروں پر ہے اور حکومت کے کارندے بے حس اور بے غیرت ہیں۔ امریکی ڈراؤن طیارے ہماری قبائلی عوام کو مار رہے ہیں۔اگر ہمارے لیڈر بے حس اور بے غیر نہ ہوتے تو ہم کسی امریکی سے آج ڈرے ہوئے نہ ہوتے۔ اگر ہمارے حکمران چاہیں تو ہماری فوج چند لمحوں میں ڈرونوں کو گرا مارے۔۔۔!''

اس سے پہلے کہ گاؤں کا کوئی اور وڈیرا بولتا' میں کھڑا ہوگیا اور بولا:

''چاچا! جو لوگ ایک بے قصور اور بے بس غریب شیدے کو انصاف نہیں دے سکتے' لیڈروں سے انصاف مانگنا انہیں زیب نہیں دیتا۔ جو لوگ اپنے عام ساتھی شہری کو اُس کے بنیادی حقوق سے محروم کرتے ہیں وہ سُپر پاور امریکہ کے سامنے اپنے حکمرانوں کو ڈٹ جانے کا مطالبہ کر کے غیرت دلاتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔''

چاچا زمیندار خاموش ہوگیا اور آج تک میں اُسے اپنی بیٹھک پر کبھی آتے نہیں دیکھا۔

انسانوں کی پہچان

مستبشرہ فاروق
10-CP-99

''وکی میں نے صرف اور صرف تم سے محبت کی ہے۔تم میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہو اور تم کہتے ہو میں ڈاکٹر سلیم سے شادی کے لئے ہاں کہہ دوں۔جبکہ ان کا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ ہماری عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔میرے گھر والوں کو تو وصیح وعریض محل، بنک بیلنس، گاڑیاں اور زیورات نظر آرہے ہیں۔ مگر میری حقیقی خوشی نظر نہیں آرہی۔وہ نہیں جانتے کہ مجھے زندگی گزارنے کے لئے مادی اشیاء کی ضرورت نہیں ہے۔بلکہ میری متاع جان،کل کائنات تو تم ہو، مجھے تمہاری صرف محبت اور چاہت چاہیے۔جو ڈاکٹر سلیم جیسے ادھیڑ عمر انسان نہیں دے سکتے۔''
میں تلملا کر بولی۔

''زارا تم ابھی جذبات میں آکر یہ سب کہہ رہی ہو۔جوش سے نہیں ہوش سے کام لو۔مصلحت اپناؤ، دور اندیشی سے کام لو اور میری ہدایات پر عمل کرو۔تم فی الحال شادی کے لئے ہاں کہہ دو۔کیونکہ سیٹھ سلیم کی دولت ہتھیانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔جب ساری دولت ہاتھ آجائے تو تم ان سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لینا۔اس جائیداد کی بدولت ہم آگے کی ساری زندگی آرام و سکون سے گزاریں گے۔زارا زندگی گزارنے کے لئے محبت اور چاہت کے علاوہ دولت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔زندگی کے تلخ حقائق جب سامنے آتے ہیں تو یہ سب افسانوی باتیں بے معنی لگنے لگتی ہیں۔'' وہ کسی قدر تحکمانہ لہجے میں بولا تھا۔

یوں میں اپنے ارمانوں کا خون کر کے ڈاکٹر سلیم کے گھر رُخصت ہوگئی۔سب کچھ تو تھا ڈاکٹر سلیم کے پاس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر سلیم انتہائی محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے اور عزت دینے والے انسان تھے۔مگر چونکہ میرے دل میں وکی کی محبت گھر کر چکی تھی۔تو مجھے ڈاکٹر سلیم کی محبت دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔یوں تو وہ عمر میں مجھ سے سترہ برس بڑے تھے۔مگر انکے وجود کو برداشت کرنا مجھے کڑوا گھونٹ پینے سے کم نہ لگتا تھا۔لیکن پھر دل کو تسلی دیتی کی بس چند دنوں کی مہمان ہوں اس گھر میں، پھر اپنے ارمانوں کو پا لوں گی۔اجنبیت کا احساس تھا۔اس گھر میں ایسا لگ رہا تھا بس ایک مشن کی تکمیل کے لئے یہاں آئی ہوں۔اور اس تکمیل کے بعد زندگی میری مرضی کے مطابق ہوجائے گی۔جب وہ جائیداد میرے نام کردیں گے تو میں خلع کا مقدمہ دائر کردوں گی۔اگر وہ طلاق دینے پر رضامند نہ ہوئے تو ان کے وجود سے چھٹکارا پالوں گی۔آخر کار دو سال کے عرصہ میں، میں ڈاکٹر سلیم کے سامنے اپنی وفا شعاری کا ڈھونگ رچانے اور ان کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہوگئی اور جائیداد اپنے نام کروالی۔زیورات، گاڑی اور بھی بہت ساز و سامان تو پہلے ہی میرا ہو چکا تھا۔پھر چند ہی دنوں بعد میں نے ڈاکٹر سلیم کو ساری حقیقت سے آشنا کردیا۔ڈاکٹر سلیم سکتے میں آچکے تھے۔میں نے سوچا تھا کہ وہ مجھ پر چیخیں گے چلائیں گے۔مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔وہ ایک تحمل مزاج اور بردبار انسان ثابت ہوئے۔ وہ کچھ روندے ہوئے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئے:

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے گھر والے ایک کچے ذہن کی چھوٹی عمر کی لڑکی سے میری شادی کررہے ہیں۔مگر جب شادی کے بعد

تمہیں راضی پایا تو میں نے سوچا کہ تمہیں محبت دوں گا، زندگی کی تمام خوشیاں دوں گا۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ مجھے طلاق دے دیں۔اس میں میری خوشی ہے۔''میں نے حتمی انداز میں کہا کیونکہ میری آئندہ کی زندگی ایک طرح سے طے تھی۔جس شخص کا میں دو برسوں سے انتظار کر رہی تھی ۔اس کے وجود کا حصول ان دو برسوں میں اور بھی قابض ہو چکا تھا۔ ایجاب وقبول کے مرحلے پر ہی محبت کا جو بیج دل کی نرم زمین پر گرا ہوا تھا۔ان دو سالوں میں وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا۔جس کی جڑیں اندر دور تک پھیلی ہوئیں تھیں اور وکی سے بھی میں یہی توقع رکھتی تھی۔

ڈاکٹر سلیم ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔مگر میں ہٹ دھرمی اور خود غرضی کی بلندیوں پر تھی ۔میں دس لاکھ حق مہر، زیورات ، ساز و سامان اور جائیداد کے کاغذات لے کر وکی کے پاس آ گئی اور ہم نے کورٹ میرج کر لی۔شادی کے دوسرے دن ہی وکی نے مجھ سے دس لاکھ کا مطالبہ کر لیا کہ وہ کاروبار شروع کرے گا اور میں نے بغیر کسی چوں چراں کے تمام رقم وکی کے حوالے کر دی۔میں وکی پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔اور شائد ڈاکٹر سلیم مجھ پر کرتے تھے۔جس طرح میں نے ڈاکٹر سلیم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ٹھیک اسی طرح وکی نے میرے ارمانوں کا خون کر دیا۔وہ ایک 'نشئی' سمگلر اور جواری تھا اور میری دی ہوئی تمام رقم ایک جوئے میں ہار بیٹھا تھا وہ میری محبت کی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتا رہا۔اس کے مطالبات بڑھتے گئے اور ڈاکٹر سلیم کے مال کو وہ اپنے باپ کا مال سمجھ کر خرچ کرتا رہا۔میرے انکار پر وہ تشدد سے بھی گریز نہ کرتا۔وہ شخص جو پہلے بظاہر ایسے دکھتا تھا کہ میرے لئے جان بھی قربان کر دے گا۔ وہ اندر سے مادہ پرستی اور بے حسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا ہوا تھا اور اپنی مادہ پرست خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مجھے تو صرف سیڑھی بنایا گیا تھا اور اب میرے پاس سوائے ندامت اور پچھتاوے کے کچھ باقی نہ رہا تھا۔میں یہ جان ہی نہ سکی تھی کہ میں نے اس دور میں آنکھ کھولی ہے۔جہاں انسانوں سے زیادہ اہمیت مال و دولت کو دی جاتی ہے۔یا پھر قصور میرا ہی تھا کہ میں نے ایک ہیرے کو ٹھکرا کر ایک کانٹے کا انتخاب کیا جس نے سوائے مجھے تکلیف دینے کے کچھ نہ دیا۔میں انسانوں کی پہچان نہ جانتی تھی اس لئے سچی محبت کو پرکھ نہ سکی۔

ایک دن وکی جائیداد کے کاغذات لے کر آیا کہ میں ان پر دستخط کر کے جائیداد اس کے نام کر دوں میں روز روز کے جھگڑوں سے تھک چکی تھی۔میں نے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔کیونکہ اب میں ایک اور فیصلہ کر چکی تھی۔اسکی اور اپنی زندگی کے ہمیشہ کے خاتمے کا۔

وہ اس روز کافی خوشگوار موڈ میں تھا۔مجھے چائے کی پیش کش کی جس پر میں نے کہا چائے میں بناتی ہوں۔تم فریش ہو جاؤ۔میں نے چائے دو کپ میں ڈالی اور دونوں میں زہر ملا دیا۔چائے کا ایک کپ ٹرے میں سجائے میں نے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُترنی شروع کیں۔

''بہت دیر لگا دی چائے بنانے میں؟ وکی تعجبانہ انداز میں بولا۔''

''اچھی چائے بنانے میں دیر تو لگتی ہے''میں نے بھی دو بدو جواب دیا۔''زارا مجھے نہیں لگتا کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی سے معافی مانگی ہو سب کو جوتے کی نوک پر رکھا مگر آج تم سے معافی مانگ رہا ہوں کیونکہ تم سے محبت کرتا ہوں۔''وکی نے کسی قدر ڈرامائی انداز میں کہا۔

''وکی ! چاہت اور نفرت دونوں ہی ایک دوسرے کا جزہ ہیں۔ جو پیار کرتا ہے وہ نفرت بھی کرتا ہے لیکن اس کی نفرت اچھی لگتی ہے۔ کیونکہ اس پر پیار کا ایک رنگ ہوتا ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں اپنے دل کا غبار نکالنا چاہا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' وکی مشکوک انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہی کہ تمہارے اور میرے درمیان جو تعلق ہے۔ اس میں نہ تو پیار کا کوئی رنگ ہے اور نہ ہی نفرت کا۔ اگر کوئی رنگ ہے تو خودغرضی کا لالچ کا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وکی چائے کا کپ تھامے مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ چائے پیو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں تحکمانہ لہجے میں کہا چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہی وکی تڑپنے لگا۔ اس کو تڑپتا دیکھ کر میں نے بھی چائے پی لی۔

اذان کی بلند آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ''شکر ہے یہ خواب تھا میں قتل اور خودکشی جیسے جرمِ عزیم سے بچ گئی'' میں خود سے مخاطب ہوئی:

اب تو گھبرا کر کہتے ہیں مر جائیں گے مر جائیں گے
اگر مر کر بھی چین نہ پایا تو تو کدھر جائیں گے

خودکشی کا احمقانہ خیال جو مجھے کئی دنوں سے آ رہا تھا۔ آج اس دعا میں بدل گیا۔

''اے اللہ تو ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں ایمان کی حالت میں موت کرنا'' میں نے وضو کیا فجر کی نماز ادا کی۔ تلاوت قرآن کے بعد گھنٹوں اللہ سے توبہ کرتی رہی اور مدد مانگتی رہی۔

وکی کے باہر جانے کے بعد میں نے جائیداد کے کاغذات نکالے اور ڈاکٹر سلیم کے پاس آ گئی میں ان سے نظر تک نہ ملا پا رہی تھی۔ لب جیسے کسی نے سی دیے تھے۔ انہوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیا۔ پھر میں نے اپنی تمام روداد سنا دی۔ اور معافی مانگی۔ انہوں نے مجھے صدق دل سے معاف کر دیا اور وکی سے خلع دلوانے کے بعد دوبارہ سے اپنی زوجیت میں قبول کر لیا۔

وکی کے خلاف مقدمہ میں جیت گئی اور وکی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ اپنی جائیداد سے فلاحی ادارے قائم کئے۔ سوچتی ہوں اگر خالق مالک دو جہاں کائنات نے مجھے اپنے دامن رحمت میں پناہ نہ دی ہوتی تو میں کیا کرتی۔ بے شک گناہوں کے اندھیروں سے تیری اطاعت کی روشن راہوں پر میرا آ جانا یہ صرف تیرے حلم کا مرہون منت ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آزمائش کی بھینٹ چڑھ کر ان بھٹیوں سے کندن بن نکلیں۔ اور کتنا پیارا ہے وہ آقا جو اپنے بندوں کو اصلاح احوال کا موقع دیتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ کوئی ان مواقع سے فائدہ اُٹھا کر سرخرو ہو جاتا ہے اور کوئی خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدقسمت بنا دیتا ہے۔

سستہ دام

محمد شہزاد
10-ENC-65

’’ سیب 50، کیلے 40، کینو40‘‘ وہ ٹھیلا دھکیلتے آواز لگا رہا تھا۔ بہت پر رونق بازار تھا۔ ہر طرف چہچاہٹ تھی۔ زندگی تھی قہقہے تھے۔ لوگ آرہے تھے، جارہے تھے، گھما گہمی تھی، شور تھا، لوگ مگن تھے۔ کوئی دکانداری میں کوئی خریداری میں۔

’’سیب، کیلے، کینو سستے دام، سستے دام‘‘، اس نے ایک دفعہ پھر آواز لگائی ’’سیب، کیلے، کینو سستے دام، سستے دام‘‘ زندگی بھی کہتے ہیں سستے دام رکھتی ہے۔ موت کا فرشتہ پرچی بھجوا رہا تھا۔ ’’پرچی۔۔۔؟‘‘

’’بابا آپ کی ٹانگ کو کیا ہوا۔۔۔؟‘‘ اس نے اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ ’’میری ایک ہی ٹانگ ہے‘‘ کچھ نہیں بیٹا۔۔۔ یہ سیب سستے ہیں پنکھے کی طرح ٹانگ جھول رہی تھی۔ خون سے لت پت تھا۔ ہر طرف گھما گہمی تھی، رونق تھی۔ کچھ لوگوں نے ہاتھوں میں موبائل اور کیمرے اُٹھا رکھے تھے۔ اس کے اردگرد گھیرا بنا ہوا تھا۔ سرکس تھا وہ تماشہ لوگ کتنے محو تھے۔ دیکھتے نہیں کتنے مگن۔ اس نے جیب ٹٹولی 50 روپے نکلے۔ خون میں بھیگے ہوئے جو ہاتھوں سے لگے خون میں مزید لال ہو رہے تھے۔ چلنے کی کوشش کی۔ دھڑام سے دوبارہ نیچے آ گرا۔ ’’بیٹا وہ سیب نیچے سے اُٹھاؤ۔ جو ابھی گرا ہے۔‘‘ اس نے اسی سے سیب پکڑا۔ ٹھیلے سے لٹکتی ہوئی گدلے پانی کی بالٹی میں ڈال کر باہر نکالا اور سیبوں کی ڈھیری پہ رکھ دیا۔ وہ رینگ رہا تھا۔ کانپتے دونوں بازوؤں کی مدد سے ایک ٹانگ ساکت رگڑ کھاتی ہوئی۔ دوسری ٹانگ کے سہارے کھینچی چلی آرہی تھی۔ درد کی ٹیسوں، ہر لمحہ خون کی کمی سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی طرف دیکھا۔ جو دور زمین چاٹ رہی تھی۔ ’’بھائی ہسپتال پہنچا دو 50 روپے میں‘‘ اس نے ٹیکسی دیکھ کر سرگوشی کی۔ جو وہ خود ہی من پایا تھا۔ ایک رکشہ اس کے قریب آرہا تھا۔ کہتے ہوئے بابا ’’50 روپے‘‘ بہت سستے ہیں۔ ایک کلو تو لے گئے سیبوں کو اس نے شاپر میں ڈالا اور 50 روپے لے لئے۔

اس نے ٹھیلا مزید آگے دھکیلنا شروع کیا۔ ’’سیب 50 روپے ‘‘ کیلے 40 روپے، کینو 40 روپے۔ وہ ایک بار پھر آوز لگا رہا تھا۔ پورے 10 سال بھتہ دیا تھا۔ 10 سال۔ پھر وہ اکڑ گیا۔ نہیں دیتا بھتہ۔ کیوں نہیں دیتا؟۔ ’’کیونکہ یہ غلط ہے‘‘ کس نے کہا غلط ہے۔ ’’اسلام نے‘‘ تیری ایسی کی تیسی۔ تیرا باپ بھی دیگا۔ اوئے بڈھے۔ 20 کے درجن ’’نہیں بیٹا 40 روپے بہت مناسب دام ہے اور کیلے بھی بہت بڑھیا ہیں۔‘‘ نہیں میرے کو 20 میں چاہیں۔ ’’بیٹا! کہیں اور سے پتہ کر کے دیکھ لو بہت سستا دام ہے۔‘‘ میں نے کہہ دیا نا۔ میرے کو 20 میں چاہیں۔ نہیں تو میں لے کر بھاگ جائے گا اور تم لنگڑہ ہو کر ہم کو نہیں پکڑ سکے گا۔ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ موٹر سائیکل پہ۔ موڑ مڑنے پہ رفتار ہلکی کی۔ ڈنڈہ پوری قوت سے اس کے سر میں آلگا تھا۔ موٹر سائیکل اس سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا۔ دور جا گرا تھا۔ 5 سے 6 آدمی ہاتھوں میں ڈنڈے لئے اس پہ چڑھ دوڑے تھے۔ اس کی کمر، ٹانگیں، اسکا سر، پیٹ، کہنیاں، بازو، لہولہان۔ ’’انکار کرتا ہے۔ انکار کرتا ہے۔ بات تو تیرا باپ بھی مانے گا۔ پرچی تو رہے گی تو رہے یا نہ رہے۔ اب انکار کر کے دکھائیں۔‘‘ منہ پہ

سوجن جسم پہ درندگی خون سے لت پت ہانپتے کانپتے اس نے بولنے والے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے زوردار جھٹکا لگا۔ درد کا ٹیسوں نے پورا وجود جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ چیخا، چیخا بہت چیخا۔ تیزی سے ٹانگ سے نکلتا ہوا خون تالاب کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ وہ کراہنے لگا۔ درد سے۔ زمین تیزی سے گھومنے لگی تھی۔ دن میں تارے دکھنے لگے تھے۔ پل بھر کو آخری سانسوں کا بھی خیال آیا۔ آس پاس لوگ تھے۔ جمع ہوئے۔ ہاتھوں میں موبائل کے کیمرے تھامے۔ ''بابا دینا ہے تو 20 کا دو۔ موڈ خراب مت کرو ہمارا۔ اس نے چپ چاپ گن کر ایک درجن کیلے شاپر میں ڈال کر دے دیے۔''

ایک دفعہ پھر ریڑھی دھکیلنا شروع کی۔ دور افق پہ پولیس والا بیٹھا تھا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا۔ ہٹا کٹا۔ مسکراتا ہوا۔ ''کسی پہ کوئی شک۔'' وہ ہسپتال میں تھا۔ اسٹریچر پہ ٹانگ ناکارہ ہوگئی ہے۔ کاٹنی پڑے گی۔ لو۔ بھیا کسی کو تو جانتا ہو۔ پولیس والا جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کوئی راہ بتائیں۔ ٹانگ کسی طریقے سے بچ جائے۔'' چلنا بحال ہوجائے۔ کاٹنا نہ پڑے۔'' اسکی بیوی شریک حیات رو رہی تھی۔ بہت شور مچا تھا وہاں۔ مریض تھے، تیمار دار، ڈاکٹرز، نرسیں۔ دور بنچ پر اس کا انس بیٹھا تھا۔ اوہ ننھی عالیہ بھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ خاموش آنسو۔ گلا گھوٹے، ہونٹ سے احتجاج، ایسا پہل بار نہ ہوا تھا۔ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس دفعہ وہ خود چل کر گیا تھا اپنی ٹانگوں پہ۔ اس فدعہ چل کر جاتا تھا دوسروں کی ٹانگوں پہ۔ ''لو بھیا۔ جلدی بتاؤ کسی پے کوئی شک ہے۔ کوئی دشمنی، خاندانی دشمنی، تجارتی دشمنی ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔''

اس نے لب ہلانے کی کوشش کی۔ درد کی ٹیسیں اُٹھیں۔ چہرے پہ ڈنڈوں کی برسات ہوئی تھی۔ ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ سوجن سے اسکا چہرہ پھولا ہوا تھا۔ لال، زخمی، خون رستا ہوا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں اپنے زیور بیچ دوں گی۔ انہیں کھڑا کر دیں۔ یہ ہمارا اکیلا سہارا ہے۔'' اس کی رفیقہ حیات منتیں سماجتیں کر رہی تھی۔ ''اس۔س'' اپنی آواز وہ خود بھی نہیں سن پا رہا تھا۔ ''اس۔ اسکن۔ ن۔ در'' اس دفعہ اس نے زور سے بولنے کی کوشش کی تھی۔ درد نے ایک بار پھر اس کے پورے وجود کو جکڑ لیا تھا۔ ''کون۔۔۔؟'' اونچا بول۔ ہمیں جلدی ہے'' اس نے ایک دفعہ پھر کوشش کی۔ ''اس۔ اسکندر حیایات'' پولیس والے کا چہرہ یکدم بگڑ گیا۔ ''سکندر حیات! تمہارے ہوش ٹھکانے ہیں'' ہنستا مسکراتا چہرہ آگ اگلنے لگ گیا تھا۔ ''بابا ہٹاؤ۔ یہاں سے ٹھیلا۔ دیکھتے نہیں ہو۔ سڑک ملی ہوئی ہے۔ کس نے اجازت دی ہے آپکو۔ ہٹاؤ یہاں سے ٹھیلا'' وہ پولیس والا تھا۔ بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے تیز تیز ٹھیلا دھکیلنا شروع کیا۔ ''دوبارہ مجھے یہاں نظر مت آنا۔ ساری ٹریفک کا راستہ روک رکھا ہے۔'' اس نے ایک مالٹا ریڑھی پر سے اچک لیا اور چھیلنے لگا۔ ''میں نے کہا تیز نکلو۔ راستہ مت روکو۔'' وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اس کے ہاتھوں سے ٹھیلا نکلتا ہوا۔ سامنے کھڑی گاڑی میں جا لگا۔ گاڑی سے غصے سے لال، دھاڑتا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص نکلا۔ ''اوئے بڈھے! ٹانگیں نہیں ہیں تو آنکھوں پر بھی پٹی باندھ رکھی ہے۔ دیکھ نہیں سکتا۔'' اس نے ٹھیلے کو واپس دھکیل دیا۔ وہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمزور ناتواں بازو ایک بار پھر سے کانپنے لگے تھے۔ ''ہاں سر یہی ہے۔ یہی ہے وہ آدمی ہے جس

نے مجھ سے گن پوائنٹ پہ موبائیل اور نقدی چھیننے کی کوشش کی ''۔''موبائیل ۔۔۔۔؟''''کس نے چھینا ۔۔۔۔؟'' وہ تو وہاں بہت سے لوگ تھے۔ جنہوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے فائر بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لوگوں نے اسکی بندوق پکڑ کر اسی ہی پہ فائر کر دیا۔ سر۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں ہی گواہ ہوں۔''بھائی۔۔۔ بھائی۔۔۔ آپ سے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے'' میرا شوہر ایسا نہیں ہے۔ اس کی کپڑے کی دکان ہے۔ بہت بڑی۔ موبائیل کیوں چھینے گا۔ اس کی بیوی نے پولیس والے کے آگے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔'' کمینے۔۔۔ موبائیل چھینتا ہے اور نام ڈالتا ہے اسکندرے پہ۔۔۔ میں دیکھتا ہوں افعتے ۔۔۔! فائل لا FIR کاٹ ۔ Mobile matuning کرتا ہے اور جھوٹا الزام من لگاتا ہے۔''بھائی صاحب۔۔۔ ضرور آپ سے غلطی ہے۔ خاور ایسا نہیں ہے۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا۔'' وہ رو رہی تھی۔''بھائی صاحب!''۔۔ انیس رو رہا تھا۔۔ اونچی آواز میں ۔ عالیہ بھی۔۔ واہ قسمت، واہ رے نصیب۔۔ امی۔۔۔ امی۔۔۔۔!

''کیا ہوا بیٹا کیوں رو رہے ہو۔ کیا ہوا؟'' وہ سڑک کے کنارے کھڑی ایک روتی بچی سے پوچھ رہا تھا۔''امی۔۔۔! کہا امی کو'' وہ روتے جا رہی تھی۔''مل نہیں رہی'' یہیں رکو۔۔۔ ابھی آجاتی ہیں''۔''امی۔۔۔ نہیں مل رہی'' مل جاتی ہیں۔ مت رو۔ بہت ہی پیاری بچی تھی۔ بالکل عالیہ کی طرح۔''امی۔۔۔ نہیں مل رہی'' اس کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لو بیٹا۔ یہ سیب کھاؤ۔ ہاتھ مار کے گرا دیا۔ اچھا بیٹا اُپر آجاؤ۔ اوپر تمہاری امی تمہیں دیکھ لیں گی۔ وہ بچی اوپر چڑھ آئی۔ بھیڑ کو چیرتی ہوئی ایک عورت آئی۔ ٹھیلے پر سے بچی کو اتارہ۔ کھینچ کر دو تھپڑ لگائے۔ کیوں بیٹھی تھی اس ٹھیلے پہ۔ تمہیں اُٹھا کر لے جاتا تو۔۔۔ ساتھ کیوں نہیں چل سکتی۔ بچی کے رونے میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ باجی یہ سیب کھلائیں بچی کو۔ مجھے نہیں کھلانا۔ شریف حلیے میں ڈاکو وہ ایک دم دھاڑی تھی۔''اب۔۔۔ آواز نیچے رکھ اپنی۔ ابھی تیری ایک ٹانگ ٹوٹی ہے کچھ اور بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ چپ چاپ بھتہ دے دیا کر'' نہیں تو۔ تو عبرت بننے والا ہے۔ ہفتے بعد وہ ایک ٹانگ کے سہارے اپنی دکان پہ آیا تھا۔''میں نے کہہ دیا ہے نہیں دیتا۔ تو نہیں دیتا'' تجھے ہو کیا گیا ہے۔ 8، 9 سال سے تو نے سکون سے بھتہ دیا ہے۔ اب کیا تکلیف ہے تیرے کو۔''یہ غلط ہے، ظلم ہے، زبردستی ہے۔ میں یہ پیسے غریبوں کو دوں گا، مسکینوں کو۔ تم لوگوں کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں'' چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نگاہیں بھسم کر دینا چاہتی تھیں۔''تو دیکھ بیٹا'' وہ دکان سے نکل گئے۔

کیلے 40 روپے، سیب 50، کینو 40۔ وہ لنگڑاتا ہوا ٹھیلا دھکیلے جا رہا تھا۔''سستے دام'' اس نے ایک بار پھر آواز لگائی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ خوشیوں کی ریل پیل۔۔ رونق تھی۔ لیکن وہ۔ راکھ کا ڈھیر۔ خالی ہاتھ مسکراہٹ سے عاری لب۔ زمانے کی تتی لو سے جھلسا چہرہ۔ دھڑکنوں سے خالی دل۔ ایک ظلمت کدہ رکھتا تھا۔ آذان ہونے لگی تھی ظہر کی۔ مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا۔ رک گیا۔ پھلوں کے اوپر میلا کپڑا چڑھایا۔ ٹوٹی سیڑھیاں بمشکل پار کیں۔ سستے دام۔ عزت بھی کتنے سستے دام رکھتی ہے۔ انا، بھرم، فخر زمین چاٹ رہے تھے۔ اللہ کا گھر تھا۔ وہ بھی اور یہ بھی۔''حضرات بقیہ نماز کے بعد ایمان و یقین کی بات ہوگی سب حضرات تشریف رکھیں۔ فائدہ ہوگا۔'' وہ مسجد میں صرف عید کے عید آیا کرتا تھا۔ یا

پھر کسی جمعے مسجد کی شکل دیکھ لی۔ رمضان کا پہلا روزہ تھا۔ بیوی کی بڑی منتوں، سماجتوں سے وہ افطاری کے بعد انس کو ساتھ لئے نماز مغرب کے لئے آیا تھا۔ نماز کے بعد مسجد کے دروازے پہ ''صرف 5 منٹ بیٹھ جائیں'' اور واقعی ان 5 منٹ کے بعد ایک مسلمان۔ اسی مسجد سے نکلا تھا۔ اس کے بعد نہ نماز چھوٹی۔ نہ سچ۔ سستے دام، سستے دام، سیب 50، کیلے 40، کینو 40، سیب 50، کیلے 40 سستے دام، سستے دام۔ ''بابا آپ کی بائیں کنپٹی پہ کیا ہوا؟''۔ ''کنپٹی۔۔۔؟'' لوہے کی سلاخ انتہائی رفتار سے اس کی کنپٹی پہ آ لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ ''بابا۔۔ کیا ہوا'' کچھ نہیں بیٹا۔ کیا چاہیے آپ کو۔۔؟ کچھ نہیں چاہیے۔ یہ پیسے پکڑیں۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے ٹھیلا آگے دھکیلنا شروع کیا۔ ''بابا یہ پیسے پکڑیں نا'' اس نے بات سنی ان سنی کر دی۔ ایک بر پھر سلاخ اس کی بائیں کنپٹی پہ آ لگی تھی۔ وہ زمین پہ پڑا تھا۔ خاموش۔ بے حس و حرکت۔ سر دائیں کروٹ پہ۔ آڑا ترچھا۔ آنکھیں کھلیں یعنی مگر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ فرش پہ سر سے نچڑتا ہوا خون تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ سرخ خون۔ جس کی قیمت پانی بھی نہ تھی۔ تو سمجھتا ہے۔ بچ جائے گا۔ ہم سے۔ بچ جائے گا۔ ہمیں سزا دلوائے گا۔ اب دیکھ بچہ تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ شعور کے کسی گمنام گوشے میں اسے سنائی دیا تھا۔ ایک لفافہ اُڑتا ہوا۔ اس کی بے حس و حرکت لاش پہ آ گرا۔ جب اسکا گودام جلا۔ اس نے شہر چھوڑنے کی ٹھانی۔ پھر ایک آخری امید پہ بے وقوفوں کی طرح وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ کال کی۔ جو نہ سنی جا سکی۔ پھر اس نے وزیر اعظم کے نام ایک خط لکھا۔ جو آج اس کی بے حس و حرکت لاش سے بہتے خون پہ تیر رہا تھا۔

''بیٹا۔۔۔!'' اس نے ٹھیلا روک دیا ''میرے ہاتھوں میں کیا ہے'' یہ سوال ہرگز نہ تھا۔ میرا روزگار ہے۔ میں روزی کما سکتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر کو رکا۔ ''یہ پیسے اسے دو جو کمانے کے قابل نہیں یا انہیں دو جن کا کوئی سہارا نہیں۔ مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ میں ابھی بھی ہٹا کٹا ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اپنے ناتواں بازوؤں سے ایک بار پھر ٹھیلا دھکیلنے کی کوشش کی اس کا جسم اچانک جواب دے گیا۔ تھوڑا دور جا کے وہ بیٹھ گیا۔ کپکپاہٹ تیز ہونے لگی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مرد تھا۔ مرد۔ ایک بار بھی اس کی آنکھوں سے ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا تھا۔ اسے لگنے لگ گیا تھا کہ آنسوؤں کے اس سیلاب کو آج نہیں دبا پائے گا۔ اس نے اپنے خیالات جھٹکنے کی کوشش وہ اُٹھا ایک بار پھر ریڑھی دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ طاقت سے خالی ہو چکا تھا۔ رینگ رہا تھا۔ ایک نامعلوم سمت کی طرف۔ ''سستے دام، سستے دام'' اس سے بولا نہ گیا۔ گلا کانٹوں سے خشک ہو چکا تھا۔ سیب 50 روپے آواز گلے سے ہی واپس لوٹ آئی۔ اسکا انس۔ اسی عمر کا ہوتا آج۔ کیا اس نے خوب دیکھے تھے۔ میری زندگی تو جیسی تیسی گزر گئی۔ اپنے بچوں کو محفوظ مستقبل دوں گا۔ دین دوں گا۔ صبر و شکر دوں گا۔ جیسا دور میں نے جہالت میں گزارا۔ میرے بچے ایسا نہیں گزاریں گے۔ انہیں حلال و حرام کی تمیز ہوگی، تربیت ہوگی، سنت ہوگی۔ وہ لڑھکتی ہوئی۔ چیختی چلاتی شعلے اگلتی، بار بار اپنی سر پٹختی، آگ کے سامنے کھڑا تھا۔ اسکی دوکان آگ کی بھٹی بنی ہوئی تھی۔ کپڑا جل رہا تھا۔ پیسہ راکھ ہو رہا تھا۔ دیواریں کوئلہ ہو رہی تھیں۔ لوگ پانی ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کھڑا تھا۔ آگ پہ نظریں جمائے۔ اس نے سرگوشیاں سنیں۔ ''وہ بھتہ نہیں دیتا تھا۔'' ''اپنی جان کا دشمن تھا۔ دے دیتا چپ کرتے۔ مجبور تو ہم بھی

ہیں۔ یوں کاروبار تو ٹھپ نہ ہوتا'' مگر اسے کوئی دکھ نہیں تھا، کوئی غم نہیں، کوئی گلہ نہیں۔ وہ اٹھکیلیاں کرتی آگ کے شعلوں کی سکرین پہ خواب دیکھ رہا تھا۔ نئی مزدہات جو عین اسلامی ہوگی۔

محنت مزدوری جو بالکل حلال ہوگی۔ حرام کی زرہ بھر آمیزش سے پاک۔ پرچی کا کوئی ڈر نہیں۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی اب آسانی سے ہوسکے گی۔ گھنٹی بجی موبائیل کی۔ گھر سے فون۔ خوامخواہ پریشان ہورہے ہوں گے۔ یہ تو خوشخبری ہے۔ نئی زندگی جو شروع ہونے والی ہے۔ ''ہیلو۔۔۔۔؟''

''ابو۔۔۔ابو۔۔۔'' ننھی عالیہ تھی ''ابو۔۔۔ آگ۔۔۔ دھشت سے چیخ رہی تھی۔'' اس کا سر گھومنے لگا، کان سائیں سائیں کرنے لگے، پیروں میں سے زمین کھسکنے لگی تھی۔ دروزانہ نہیں کھل رہا، باہر سے کنڈی لگی ہے۔ دوسری آواز انس کی تھی۔ جو دور سے چیخ رہا تھا۔ فون کی۔۔۔۔ پھٹنے والی ہوگئیں۔ سانسیں بند ہوگئیں۔ دل سینہ پھاڑ کر باہر آجانا چاہتا تھا۔ روتیں بن گئی۔ موبائیل وہیں گرا۔

اللہ۔۔۔۔اللہ۔۔ سب منظور ہے۔۔۔ سب منظور ہے۔ سب پہ راضی اے اللہ۔۔۔ یہ نہیں۔۔۔۔ یہ نہیں ۔۔اللہ ۔۔۔۔ نہیں۔۔اس نے دوڑنے کی کوشش کی۔ زمین پہ آرہا۔ ٹانگ ٹیس دینا بھول گئی۔ اب صرف ایک چیز تھی۔ گھر، گھر۔ ''اللہ۔۔۔ جو تو کہے گا۔ کروں گا۔۔۔ جو تو کہے گا۔۔۔ یہ نہیں میر اللہ ۔۔۔ یہ نہیں۔۔۔'' اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ رینگنے لگا۔ تیزی سے۔ بہت تیزی سے۔ ''اللہ، اللہ۔۔ ان کا قصور نہیں۔۔ میری جان لے لے۔ مجھے جتنی تکلیفیں دینی ہیں۔ دے۔ انکا قصور نہیں۔ اللہ۔۔ اللہ۔۔۔ نہیں'' اس نے ایک رکشہ والے کو ہاتھ دیا۔ وہ آگ کی طرف متوجہ تھا۔ ''اللہ ایک کام بھی تیری منشاء کے خلاف نہیں کروں گا۔ تیری قسم اللہ۔ بچالے۔ بچالے۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔'' اس نے رکشہ والے کو آواز دی وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ سہارہ لے کر اُٹھا۔ رکشے میں بیٹھا۔

''سب لے لے۔ سب لے لے اللہ ایک بات بھی نہیں نکلے گی زبان سے۔ یہ نہیں اللہ۔ یہ نہیں۔ بچالے۔ اللہ۔۔ بچالے'' گھر کے قریب اسے دھواں اُٹھتے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈر سا گیا۔ سر پہ ہتھوڑے برسنے لگے۔۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر اپنی دنیا کو خاکستر ہونے سے بچالے۔ گھر کے سامنے بم عفید لگا تھا۔ لوگ پانی پھینکنے کے لئے دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ رکشے سے نکلا۔ نیچے آگرا۔ رینگنے لگا۔ تیزی سے لوگوں کے پاؤں میں سے ہوتا ہوا۔ وہ راکھ ہوئی اپنی دنیا کی طرف بڑھنے لگا۔ دو تین آدمیوں نے اسے پکڑ کر اُٹھایا۔ ''اب دیر ہوگئی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے۔'' اس کی زندگی۔ اسکی کی جمع پونجی اف۔۔۔ ''ہم نے بہت کوشش کی'' وہ خود اس آگ میں جل مرنا چاہتا تھا۔ اپنی دنیا کے ساتھ اس نے ایک بار پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ زمین پہ آرہا۔ اسکا سائبان، اسکا گھر، اسکی واحد خوشی، واحد سکون وہ ایک بار پھر تیزی سے رینگنے لگا تھا۔ لوگ اسے اُٹھا کر پھر پیچھے لے آئے۔

''چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو مجھے'' وہ چلانے لگا، ''چھوڑ دو مجھے'' اس کا سکون، اسکی دنیا ''چھوڑ دو مجھے''۔

ایک دم وہ رک گیا۔ اس کے ٹھیلے کو اسی نوجوان نے روک رکھا تھا۔ بابا۔۔۔ آہستہ چلیں۔۔۔۔ اپنے ساتھ آپ نے دوسروں کا بھی نقصان کرنا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ آنکھوں میں نمی۔ اپنے بندتر وانے

لگی تھی۔ کانپتے ہوئے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ شکل مرجھا گئی تھی۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ آنسو کا ایک بھی قطرہ اس کی آنکھوں سے نہ ٹپکے۔ جذبات ہمیشہ اس کے ارادوں، حوصلوں کے غلام رہے۔ مگر اب جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اسے قابو کرنے کے درپے تھا۔ وہ لڑکا چلتا ہوا۔ اس کے قریب آیا۔ اس سے اسکا ٹھیلا لیا۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک پتلی گلی کی طرف مڑ گیا۔ ٹھیلا روکا۔ بابا کی طرف منہ کیا۔ اس کی سفید داڑھی کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ آنکھیں نم تھیں وہ رو رہا تھا۔

''بابا۔۔۔ کیا ہوا بتائیں کیا ہوا۔ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں۔ آپ اکیلے ہرگز نہیں رہے۔ میں ہوں نہ'' ''بابا آنے دیں ان آنسوؤں کو مت ہونٹ بھینچیں۔'' وہ انکی دستک آنکھوں پے انگلی پھیر رہا تھا۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ان کی ہچکی نکل گئی تھی۔

''بیٹا۔۔۔! ان کی آواز واضح کانپ رہی تھی۔ بیٹا ایک طرف حق تھا۔ ایک طرف باطل۔۔۔'' وہ رکے ''بیٹا ایک طرف آخرت تھی۔ ایک طرف دنیا'' وہ ہکلانے لگے تھے۔ ایک طرف حکم تھا ایک طرف سرکشی۔ ''اور اور'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ''اور ایک طرف اللہ تھا اور ایک طرف پوری کی پوری زندگی'' اور ان کے آنسوں بہنے لگے تھے۔ بند ٹوٹ گیا تھا۔ ''اور تمہیں۔۔۔ تمہیں پتا ہے'' بدن کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ ''میں نے'' وہ اب زار و قطار رو رہے تھے۔ ''میں نے اللہ کو چن لیا تھا بیٹا۔۔۔۔''

سنہری باتیں

۳۶۔ میں عمر کے اُس حصے میں ہوں کہ جب ہر وہ روز روز عید لگتا ہے جب آپ اُٹھیں اور کوئی چیز پریشان نہ کرے۔ (ایچ مارٹن)۔

۳۷۔ چالیس سالہ مرد چالیس سالہ عورت سے جوان نظر آتا ہے۔ اس میں بھید یہ ہے کہ چالیس سالہ عورت حقیقت میں پچاس سال کی ہوتی ہے۔

۳۸۔ بوڑھا ہونے میں صرف ایک خوبی ہے۔ وہ یہ کہ آپ ابھ مرے نہیں۔

۳۹۔ آہ! مت کہو کہ تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو۔ کیونکہ جب بھی کوئی یہ کہتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ میں غلط ہوں۔

۴۰۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ ہماری بیماریاں ایک جیسی ہیں۔

۴۱۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حس مزاح نہایت قیمتی شے ہے۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے لطیفوں پر بھی ہنسا کریں۔

۴۲۔ کم از کم ایک نقطے پر مرد اور عورت دونوں کا اتفاق ہے۔ وہ یہ کہ عورت نا قابل اعتبار ہوتی ہے۔

۴۳۔ کامیابی کی راہ ہمیشہ تعمیری مراحل میں رہتی ہے۔

۴۴۔ دنیا میں صرف دو طرح کا پیسہ گردش کرتا ہے۔ تمہارا پیسہ اور میرا پیسہ۔

۴۵۔ جس دن میرا جی چاہتا ہے کہ میں گھر صاف کروں، اسی دن نوکرانی جھاڑو، پونچھا لئے آدھمکتی ہے۔

کچھ لوگ سمندروں سے بھی گہرے ہوتے ہیں جس طرح

ام ہانی
11-SE-21

یار تم کیوں مرے ہوئے قدموں سے پیچھے پیچھے چل رہی ہو؟ فریا نے بغیر رکے گردن موڑ کر کہا تھا۔ یہ کیا تم نے نئی نویلی دلہن کی طرح نظریں جھکائی ہوئی ہیں منہ تو اوپر کرو اپنا۔ اب کہ یہ حراتھی۔ ویسے یار آج کل تو دلہنیں بھی ایسے نہیں چلتیں۔ عروہ کی بات پر سب کا مشترکہ زوردار قہقہہ بلند ہوا تھا۔ ان کو بحث کا ایک نیا موضوع مل چکا تھا۔ اپنے سے چند قدم پیچھے چلتی ہانیہ مغل کو وہ یکسر نظر انداز کر چکی تھیں۔ اور ایسا تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔

ہانیہ مغل۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں میکاٹرونکس انجینئرنگ تھرڈ ایئر کی سٹوڈنٹ۔ ہر ایک سے مسکرا کر ملنے والی وہ لڑکی جس سے کسی کو کوئی گلہ نہ تھا۔ جس کے لیے اپنی عزت، انا، خودداری سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ خاموش بے حد خاموش رہنے والی وہ لڑکی جسے خاموش رہنے پر ''مغرور'' اور ''اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھتی ہے'' جیسے خطاب مل چکے تھے۔

اس رات وہ بہت دیر تک نہیں سو سکی تھی۔ اس کی روم میٹ آصفہ نے ایک معمولی سی بات پر اسے اتنی باتیں سنا دی تھیں اور وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ حق پر ہے جانتی تھی کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا مگر پھر بھی خاموش رہی۔ اس رات تکیے میں منہ دے کے روتے ہوئے وہ خدا سے شکوہ کناں تھی۔ اتنا کچھ برداشت کرنے کے بعد بھی اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ کیسے سب کچھ برداشت کر پائے گی۔ روتے روتے نجانے کب وہ سو گئی تھی۔ لیکن اگلے ہی دن اسے موبائل پر ایک میسج موصول ہوا تھا۔ حدیث ''میں ایک محل لے کر دینے کا ذمہ دار ہوں۔ جو جنت کے ایک طرف ہوگا اور یہ اس شخص کے لیے ہوگا جو حق پر ہونے کا باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔۔۔۔ ''(ابوداؤد)

اور ہانیہ مغل کھل کے مسکرائی تھی۔ طمانیت کا احساس اس کے اندر تک اتر گیا۔ کوئی ہے جو اس کا بہت خیال رکھتا ہے، جو اس کے ساتھ ہے، جسے اس کے آنسوؤں کی پرواہ ہے۔ کتنا خوش کن احساس تھا۔ ہاں وہ اس کا اللہ تھا۔ اور اسے اب اپنے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔

وہ کوئی تہجد گزار لڑکی نہیں تھی نہ ہی کثرت سے تسبیحات و نوافل پڑھنے والی۔ ہاں وہ پانچ وقت نماز پڑھنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ لیکن روزمرہ زندگی کے دیگر معاملات میں اسے خدا ضرور یاد رہتا تھا۔ بہت ساری کمیاں کوتاہیاں اس کے اندر بھی تھیں۔ کوئی انسان ہر لحاظ سے بہتر ہوتا بھی نہیں۔

یار آپ میں سے کسی کے پاس ایکسٹرا فون ہوگا؟ میرا موبائل گرا تھا اب چل نہیں رہا۔ وہ صحیح معنوں میں پریشان تھی۔ فائقہ سے فون ملتے ہی اس نے اپنے گھر کال کی تھی۔ ''ایک تو اس فون کے فنکشن عجیب ہیں کھولو کچھ کھل کچھ جاتا ہے یا پھر شاید مجھے عادت نہیں ہے۔'' اس نے خود کلامی کی تھی۔ ''ہانی'' اس کی نظریں بس اس ایک لفظ پر ٹھہر سی گئی تھیں۔ ڈرافٹس میں save اس میسج میں اپنا نام پڑھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پڑھتی گئی۔ شاید یہ انسان کی فطرت ہے کہ اپنا نام سن کر یا پڑھ کر وہ لاتعلق نہیں رہ سکتا، اس کی طرف متوجہ ضرور ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہانیہ مغل کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ کیا اس کے بارے میں وہ زہر آلود الفاظ فائقہ کے ہی تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پر گزشتہ چند دنوں کے واقعات گھوم گئے۔ اس نے تو کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ حسد کی آگ بھی کیا ہوتی ہے؛ انسان کو جلا کے رکھ دیتی ہے۔ تو کیا اس کا

زبردستی کسی کے گروپ میں گھسنا اچھا ہی نہیں لگتا۔ کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں جو مجھے ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہیں لیکن میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتی۔ یونیورسٹی کی روڈز پر قہقہے لگانا، اونچی آواز میں باتیں کرنا، لڑکے لڑکیوں کے افیئرز پر بحث کرنا اور دوسروں پر کمنٹ کرنا۔ یہ سب میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ نتیجتاً میں سب سے الگ ہوتی گئی ہوں۔ کبھی کبھی میرا بھی دل کرتا ہے یونیورسٹی لائف انجوائے کرنے کو، گھومنے پھرنے کو، کسی سے ڈھیر ساری باتیں شیئر کرنے کو لیکن میں اپنے اصول نہیں توڑ سکتی۔ اگر میں سب کے ساتھ ہوتی بھی ہوں تو یوں جیسے وہاں ہوں ہی نہیں۔'' شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

اگر اس میں کچھ اچھا تھا تو وہ اس کے ماں باپ کی تربیت تھی اور وہ کچھ بری تھی تو وہ اس کی اپنی کوتاہی تھی۔

یونیورسٹی سے آ کر وضو کرتے ہوئے اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پوری نماز میں وہ روتی رہی تھی۔ جس کے سامنے رونے کا حق ہے اس کے سامنے کیوں نہ رویا جائے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ خود سے منسلک سب رشتوں کے لیے دعا کے بعد وہ سجدے میں گر گئی تھی۔ ''اللہ تعالیٰ جی آپ کو تو سب پتا ہے نا۔ آپ سب کچھ دیکھتے ہیں نا۔ میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔ کبھی جانتے بوجھتے کسی کا دل نہیں دکھایا۔ میں کیا کروں اللہ تعالیٰ جی۔ مجھے اکیلا نہ چھوڑیں کبھی۔ آپ تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتے ہیں نا۔ مجھے سیدھے رستے پر رکھنا میرے اللہ۔ میرے لیے میرے کام آسان کر دے۔ مجھے برداشت کا حوصلہ دینا۔ مجھے لوگوں سے اچھے سلوک کا حوصلہ دینا۔ میں دوسروں جیسا نہیں بننا چاہتی۔ میں تیری عاجز گنہگار بندی۔۔ مجھے ویسا بنا دے جیسا تجھے پسند ہے۔ مجھے کسی بھی غلط رستے پر چلنے سے روک لینا جیسے تو نے ہمیشہ میرے قدموں کو غلط سمت جانے سے روکا۔ یا اللہ میں نے ہمیشہ تجھ سے شہادت کی موت مانگی ہے آج میں تجھ سے سعادت کی زندگی بھی مانگتی ہوں۔''

ایک ہفتے کی سمسٹر بریک ہاسٹل میں رہنے والوں کے لیے غنیمت تھی۔ ''ماما آپ جیسا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کیسے دوسروں کے لیے اتنا کچھ کر لیتے ہو وہ آپ کے ساتھ جو بھی کر لیں''۔ ہانی میں نے تمہیں ہمیشہ سمجھایا ہے کہ صرف اپنے آپ کو ٹھیک رکھو، لوگ جیسے بھی ہوں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں یہ سب اللہ کے لیے کرتی ہوں۔ اگر کسی کو مجھ سے امید ہوتی ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ اس کو کسی بھی طرح پورا کروں۔ اس کی ماں نے بڑے آسان الفاظ میں اسے نقطہ سمجھا دیا تھا۔ ''میں سب کو معاف بھی کر دیتی ہوں، بہت برداشت بھی کر لیتی ہوں، بدگمانی نہیں رکھتی، دوسروں کی مدد بھی کرتی ہوں پر آپ جتنا ظرف مجھ میں نہیں۔ میں آپ جیسی نہیں نہیں بن سکتی ماما۔'' ''ہانی تمہاری آنکھیں کیسی ہو گئی ہیں؟ ویران ویران سی۔'' اس کی چھوٹی بہن نے کہا تھا۔ اس نے تو آئینہ کبھی اتنے غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔

اس کے اندر کتنے لوگوں کے راز مدفن تھے۔ وہ ہمیشہ سنتی تھی مگر بولتی نہیں تھی۔ کسی ایک کو کچھ بتانے کا مطلب تھا ساری دنیا کو بتا دینا۔ اور بات تو وہاں کی جائے جہاں کوئی سمجھنے والا ہو۔ لوگ اس پر اعتماد کرتے تھے مگر وہ کس کو اپنا ہمراز بناتی۔ راز بھی ایک امانت کی طرح ہوتے ہیں جن کو سنبھالنے کے لیے بہت مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کمزور سی لڑکی کے دل پر کتنا بوجھ تھا۔ رازوں کا بوجھ۔ غم تو یہ

موبائل خراب ہونا محض اک بہانہ تھا۔ درحقیقت اللہ نے اس پر شعور کے کتنے در وا کیے تھے۔

یونیورسٹی میں اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ بچپن میں بھی شاید ہی اس کی کوئی ایک آدھ سہیلی تھی۔ ورنہ نت نئی دوستیں بنانا لڑکیوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ شاید اس کے لیے دوستی کا معیار، معنی، مفہوم سب کچھ بہت الگ تھا۔ ایک بچگانہ سی خواہش تھی اس کی جو بھی دوست ہو صرف اس کی ہو، جو اس کو سمجھ سکے، جو اس کے ساتھ sincere ہو۔ اور شاید اسے ایسا کوئی مل ہی نہ سکا تھا۔ بہت سی عادتیں اس کی عام لڑکیوں سے مختلف تھیں چاہے وہ پازیٹو ہوں یا نیگیٹو۔ فیشن کے نام سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا حالانکہ اس کا تعلق کسی کنزرویٹو ماحول سے نہ تھا۔ اگر اس کی سادگی یا باپردگی اسے دقیانوسؤ بناتی تھی تو اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ اگر لوگوں کے نزدیک یہ قدامت پسندی تھی تو وہ قدامت پسند ہی اچھی تھی۔ لڑکوں سے دوستی کرنا اسے پسند نہ تھا۔ اس کے نزدیک یہ فقط ایک نام نہاد رشتہ تھا جس کی نہ تو کوئی بنیاد ہے اور نہ ہی کوئی جواز۔

تمہیں کونسا روگ لگا ہوا ہے؟ دھم سے اپنے بستر پر گرتے ہوئے آصفہ نے کہا تھا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ ہانیہ کے چہرے پر پھیلی تھی۔ چوبیس گھنٹے موبائل پر texting میں مصروف رہنے والی آصفہ دوبارہ texting میں مصروف ہو چکی تھی۔ تم کیا جانو آصفہ بی بی! ہانیہ نے دل میں سوچا تھا۔ اپنی نیلے رنگ کی ڈائری اٹھا کر وہ ہاسٹل کے نسبتاً پر سکون حصے میں آ گئی۔ وہ شاذ و نادر ہی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ آج بھی وہ ڈائری اٹھا تو لائی تھی مگر لفظ ساتھ دینے کو تیار ہی نہ تھے۔

''آہستہ آہستہ آپ کو سب چیزوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی ان کے رویوں کی، باتوں کی، لہجوں کی۔ اور ہاں شاید الفاظ کچھ معنی نہیں رکھتے، یہ لہجے ہی ہوتے ہیں جو کسی خنجر کی دھار کی طرح ہمارے اندر تک اتر جاتے ہیں۔ میں نے خود کو ہاسٹل میں، یونیورسٹی کے ماحول میں ایڈجسٹ تو کر لیا ہے، بات بے بات رونا بھی چھوڑ دیا ہے پر راز کی بات ہے کہ میں اب بھی روتی ہوں چھپ کے، لیکن لوگوں کے سامنے میں بہت سٹرانگ ہوں۔ میں آج کل بہت ہنستی ہوں اور یہ بات بہت سے لوگوں نے نوٹ کی ہے۔ اپنی ہنسی کی آڑ میں نجانے میں کیا چھپانا چاہتی ہوں۔ میں کوئی مظلوم لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے تو اللہ نے اتنا نوازا ہے کہ جتنا شکر کروں کم ہے۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی، میرا گھر ہی میرا سب کچھ ہے۔ میرے پاپا میرے لیے آئیڈیل مرد ہیں، ان جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ میری فیملی میری سب سے بڑی سپورٹ ہے۔ زندگی کی ہر آسائش ملی ہے مجھے۔ پیار بے انتہا ملا ہے محبتیں بے شمار ملی ہیں، خوشیاں بے حساب ملی ہیں۔ کامیابیاں۔ عزت، نام سب کچھ ملا ہے۔ میرے گھر والوں نے کبھی مجھ پر کوئی restriction نہیں لگائی۔ میں نے جو کرنا چاہا مجھے کرنے دیا۔ پھر آخر کیا مسئلہ ہے میرے ساتھ۔ میں کسی سے کچھ ایکسپیکٹ نہیں کرتی پر شاید کسی نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ I don't care کا لیبل لگائے ہوئے یہ لڑکی اندر سے کتنی حساس ہے۔ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے طنز، بے لچک لہجے اور غصے سے بھرپور آوازیں میرے اندر کتنا دکھ بھر دیتی ہیں۔ خود کو لاکھ پتھر سمجھوں دل تو میرے پہلو میں بھی ہے۔ انسان تو میں بھی ہوں، درد مجھے بھی ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں اپنے کام کے لیے اکیلے بھاگ دوڑ کرنا بہت عجیب لگتا ہے۔ لیکن شکر ہے مجھے اپنے کام کے لیے دوسروں پر انحصار کرنے کی عادت نہیں ورنہ پتا نہیں کیا بنتا۔ اتنی لڑکیوں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلے ہونا تھوڑی عجیب بات تو ہے۔ ایک تو سب کے گروپس ہیں اور مجھے

تھا کہ اس کی ڈائری بھی یہ بوجھ نہیں سہار سکتی تھی۔ ''کبھی کبھی ہم لکھنے بیٹھیں تو ہمارے الفاظ کھو جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور جو سمجھ آتا ہے وہ لکھا نہیں جاتا۔ آپ سوچ رہے ہوتے ہیں مگر کیا؟ آپ کو خود نہیں پتا ہوتا۔ کبھی آپ کا رونے کو بہت دل چاہتا ہے مگر کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ آپ رونا نہیں چاہتے مگر آنسو زبردستی پلکوں کا بند توڑنا چاہتے ہیں۔ شاید وہ ہمارے اندر کی خاموشی سے گھبرا جاتے ہیں۔ کتنی بے بسی ہوتی ہے جب کسی کے سامنے ہم رونا نہیں چاہتے مگر یہ آنسو ہمیں ہرانے پر تلے رہتے ہیں۔ پتا نہیں آنکھوں کے اندر اتنا سیلاب کہاں سے اکٹھا ہو جاتا ہے۔'' ڈائری بند کر کے اس نے اپنا سر اس پر ٹکا دیا تھا۔

خواہشات، جذبات، احساسات ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ کوئی خود کو کس حد تک ان کا غلام بناتا ہے یہ اس پر منحصر ہے۔ ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق اپنے غم سنبھالتا ہے۔ اپنے ظرف کے مطابق بات کرتا ہے۔ لوگ نجانے کیوں اپنے رویوں پر غور نہیں کرتے۔ ہمارے الفاظ کسی کو بہت اندر تک توڑ سکتے ہیں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ ہاں کوئی اپنے دکھوں کو اشتہار کی طرح سرِ عام لگا دیتا ہے تو کوئی اپنے غم دل کی تہہ میں چھپا لیتا ہے۔ یہ بھی ظرف ظرف کی بات ہے۔ جس میں جتنا ظرف ہوتا ہے وہ اتنا ہی خاموش ہوتا ہے۔ کتابوں کی طرح الفاظ سے بھرپور مگر خاموش۔ مگر ہم نے ان بند کتابوں کو کھولنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اور تنہائی کی دیمک انہیں اندر ہی اندر چاٹ لیتی ہے۔

سنہری باتیں

۴۶۔ کسی کے دل میں اترنے کا تیز ترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی چھاتی میں سراخ کر دیں۔

۴۷۔ ہنسو۔۔۔لوگ بھی تمہارے ساتھ ہنسیں گے۔ روؤ! اور لوگ تم پر ہنسیں گے۔

۴۸۔ ہم اپنی نوکرانی کو کمرشل نوکرانی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ صرف کمرشل کے دوران ہی کام کرتی ہے۔

۴۹۔ اگر ایشیاء کپ کا فائنل سری لنکا نہ جیتتا تو پاکستان کبھی نہ ہارتا۔

۵۰۔ چوک والا ریسٹورنٹ اتنا مشہور ہے کہ اب کوئی وہاں نہیں جاتا۔

۵۱۔ میں کہتا ہوں زندہ رہو، زندہ رہنے دو۔ جو اسکا مخالف ہے، اُسے قتل کر دینا چاہیے۔

۵۲۔ میرا ذہن بھٹکتا رہتا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ وہ اتنا کمزور ہے کہ زیادہ دور نہیں جا سکتا۔

۵۳۔ ہمارے ملک میں ہر پانچویں منٹ ایک خاتون ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔ اگر ہم آبادی کم کرنا چاہتے ہیں تو اس خاتون کو ڈھونڈنا ہوگا۔

۵۴۔ مجھے دوست نے فون کیا۔ ''آجاؤ، گھر پر کوئی بھی نہیں ہے'' سو میں چلا گیا واقعی وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

۵۵۔ ہمارے ملک میں قانون و انصاف کی کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن وکیلوں کی کمی کبھی نہیں ہوئی۔

احساس کے رشتے

ام ہانی
11-SE-21

وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ڈیپارٹمینٹ سے نکل رہی تھی اور اب وہ ہاسٹل کی صرف جا رہی تھیں۔گرمی کی شدت میں اب اضافہ ہونے لگ گیا تھا لیکن شاید آج اسے گرمی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔اس کا ذہن آج کسی بات میں الجھ گیا تھا۔کیا واقعی ہم اس دور میں آ چکے ہیں جہاں کوئی سچا رشتہ ڈھونڈنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے؟اور وہ اپنے سے منسلک ہر رشتے کو پرکھنا شروع ہوگئی تھی۔اس کے ذہن میں اسکی سب دوستیں باری باری آنے لگی تھیں، پھر بہن بھائی، والدین، وہ ان کی کہی گئی چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کر رہی تھی جن کی وجہ سے وہ کبھی بہت ہرٹ ہوئی تھی۔جب اچانک اس کو انعم کے قہقہے نے ان خیالات سے باہر نکالا۔پتا نہیں وہ کس بات پر ہنسی تھیں، پتا نہیں وہ کب سے کیا باتیں کر رہی تھیں، اسے احساس بھی نا ہوا تھا۔پہلے وہ کبھی رستے میں ایسے خاموشی سے چلتے نہیں آتی تھی اور جب کبھی آتی تھی تو اس وقت وہ کسی سے ناراض ہوتی تھی یا موڈ اوف ہوتا تھا۔لیکن آج تو وہ کسی سے ناراض نہیں تھی۔اب وہ سوچ رہی تھی کے پتا نہیں اس کی فرنڈز کیا سمجھ رہی ہوں گی کہ شاید میں ناراض ہوں ان سے یا شاید انہوں نے نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔اس کا ذہن پھر سے خیالات کی دنیا میں واپس جا رہا تھا۔اس نے پھر سے سوچا کیا اب وہ ناراض بھی ہوتی ہے کبھی؟ اسکے ذہن نے فورا کہا تھا نہیں اب تو میں ناراض نہیں ہوتی کسی سے بھی۔اگلا سوال آیا تھا لیکن کیوں؟ میں نے ناراض ہونا کیوں چھوڑ دیا؟ کیا اب میں نے لوگوں سے امیدیں لگانا چھوڑ دی ہیں؟ اور پھر سے اس کا ذہن اب اسی ایک سوال کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے خدکو ان خیالات کی دنیا سے باہر نکال لیا۔اب وہ چاروں ہاسٹل کے دروازے سے اندر جا رہی تھیں۔اور اب اسے انعم، عنیزہ اور ایمان کے ساتھ چلتے گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔

اپنے روم میں جاتے ہی ندا نے پنکھا چلایا تھا اور تھوڑی دیر گرمی کا احساس کم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔پھر اس نے ڈریس چینج کر کے وضو کیا تھا۔اور اب وہ سوچ رہی تھی کے آج اسے اللہ تعالی سے کیا باتیں کرنی تھیں۔یہ اس کی عادت بن گئی تھی شاید کے دعا میں للہ تعالی سے ایسے باتیں کرنا جیسے اپنے فرنڈز سے کرتے ہیں یا شاید جیسے ہم اپنے فرنڈز سے بھی کبھی نہیں کر سکتے ہیں۔لیکن یہ عادت بہت پرانی نہیں تھی۔اس نے نماز کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو پہلا سوال اس نے یہ کیا کہ یا اللہ تعالی کیا رشتے صرف وہی ہوتے ہیں جو پیدا ہوتے ساتھ ہی بن جاتے ہیں؟ اور اس کے بعد بننے والا کوئی بھی رشتہ پائیدار نہیں ہوتا؟ کیا محبت صرف خون کے رشتوں تک رہ گئی ہے؟ اگر رشتے احساس سے بنتے ہیں تو پھر وہ احساس جب ختم ہو جاتا ہے تو کیا وہ رشتے بھی ختم ہو جاتے ہیں ساتھ ہی؟ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اب اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر گر رہے تھے اور وہ للہ تعالی سے کہہ رہی تھی کہ یا اللہ تعالی شاید میں ہی غلط ہوں۔شاید میری زندگی میں ہی سب سے اہم احساسات ہیں۔شاید میں لوگوں سے بہت زیادہ امیدیں لگا لیتی ہوں۔یا شاید احساس کا کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا۔یا شاید کچھ چیزیں ہماری سوچ پر اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں کے ہم ہر رشتے سے بدگمان ہونے لگ جاتے ہیں۔وہ رشتے جو بہت مقدس ہوتے ہیں ان سے بھی۔ندا نے منہ پر ہاتھ پھیرے اپنے آنسو صاف کیے تھے، تھوری دیر جائے نماز پر بیٹھ کے خود کو نارمل کرنے کے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ اٹھ گئی تھی اور وہ چہرے پر ہمیشہ کی طرح آئی ہوئی مسکراہٹ کو واپس لے آئی تھی۔تھوڑی سی دیر میں وہ اپنی فرنڈز کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھی۔شاید اب وہ وہ والی ندا بن گئی تھی جسے سب جانتے تھے۔تھوڑی دیر پہلے والی ندا کے تو اب کہیں اثرات تک نظر نہیں آ رہے تھے۔وہ اب ہنسنے میں ایسے مگن تھی جیسے اسے کسی بات کی کوئی پرواہ ہی نا ہو۔اور اب یہ زندگی کو گزارنے کے لیے ضروری بن چکا تھا۔اور یہ اس نے یہاں آ کر ہی تو سیکھا تھا۔

سارا دن روٹین کے مطابق ہے چل رہا تھا لیکن وقفے وقفے سے اس کے ذہن میں وہ باتیں ریپیٹ ہو رہی تھیں، جہاں سے اس نے اپنی سوچوں کا آغاز کیا تھا۔ جب انعم نے اسے ایک لڑکی دکھائی تھی اور ساتھ ساتھ وہ اس کی سٹوری سنا رہی تھی۔ u know اس کا ابھی recently break up ہوا ہے اور تم نے اس لڑکے کو دیکھا ہے؟ ندا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ کہیں نظر آیا تو ضرور دکھاؤں گی۔ پھر ان سب نے اس لڑکی کو اپنا موضوع بنا لیا تھا۔ ندا نے ایک بار پھر سے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو اسے ایک دم سے اس پر ترس آنے لگ گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ شاید وہ اس کی feelngs judge کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس کے لیے۔ وہ جب سے یونیورسٹی آئی تھی۔ اس نے یہ ٹاپک بہت کثرت سے سنا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد بہت سی لڑکیوں کو انہی حالات سے گزرتے دیکھا تھا اور وہ انہی لوگوں میں سے تھی جو ہر بات کو بیٹھ کے گھنٹوں سوچتے رہتے ہیں۔ لیکن آج اسکا ذہن انہی باتوں کو کسی اور طرح سوچ رہا تھا۔ اس نے جتنا یونیورسٹی آ کر رشتوں کو بے معنی ہوتے دیکھا تھا اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا کے یونیورسٹی آنے سے پہلے تک وہ یہ سمجھتی تھی کے رشتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ وہ رشتے جو پیدا ہوتے ساتھ ہی مل جاتے ہیں اور مرتے دم تک ختم نہیں ہوتے اور وہ رشتے جو احساس اور محبت سے بن جاتے ہیں حالانکہ ہم انہیں جانتے تک نہیں ہوتے۔ لیکن آج اسے لگا تھا کے رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں۔ احساس کے رشتے وقت کے ساتھ ساتھ کمزور پڑ جاتے ہیں اور پھر ختم ہو جاتے ہیں اور جو ختم ہو جاتے ہیں وہ رشتے تو نہیں ہوتے نا؟ وہ تو احساس کے رشتے کو بہت اہم سمجھتی تھی مگر اس نے یہاں آ کر احساس کے رشتے سے نفرت شروع کر دی تھی۔ اس نے ان ہی رشتوں کی وجہ سے اپنے اردگرد بہت سے لوگوں کو اپنی زندگیاں خراب کرتے دیکھا تھا۔ اور وہ یہ سوچ کے ہمیشہ اداس ہو جاتی تھی۔

سارا دن اپنی روٹین سے گزارنے کے بعد اب وہ سونے کے لیے لیٹی تھی۔ اور یہ وہ وقت ہوتا تھا جب وہ بہت فراغت سے سوچتی تھی ہر بات کو۔ اس نے اپنی سوچوں کے تسلسل کو پھر سے جوڑا تھا۔ اس تباہی میں قصور کس کا ہوتا ہے؟ وہ اپنے اردگرد لوگوں کو سوچنے لگی تو اسے لگا شاید دونوں کا۔ کیا وہ یہ سب کر کے اپنے گھر والوں کو دھوکا نہیں دے رہے ہوتے؟ کیا وہ کبھی بھی نہیں سوچتے کے کبھی ان کو بھی اپنے پیرنٹز کی جگہ پر آنا ہے؟ پھر وہ کیا کرتے ان حالات میں؟ وہ صرف خود کو تباہ نہیں کرتے بلکہ وہ محبت کے نام کو لوگوں کی نظر میں کمزور کرتے جا رہے ہوتے ہیں۔ جیسے میں نے یہاں آ کر احساس اور محبت کے رشتے کو بہت بے معنی ہوتے دیکھا تھا۔ صرف انہی رشتوں کی وجہ سے۔ اور انہی رشتوں کی وجہ سے میں نے لڑکیوں کو اپنے والدین کو دھوکا دیتے دیکھا تھا، اپنی دوستوں سے دور ہوتے دیکھا تھا اور اللہ تعالی سے بھی۔ کیا یہ رشتہ بھی احساس کا ہوا پھر؟ جس میں ہم ایک انسان کا احساس کرتے ہیں اور اتنے مضبوط رشتوں کی محبت کو بھول جاتے ہیں؟ اور محبت ڈالنے والے تو اللہ تعالی ہیں نا۔ اس نے تو لڑکیوں کے لیے صرف دو ہی کیٹیگریز بنائی ہیں۔۔ محرم اور نامحرم کی۔ پھر یہ درمیان کا رشتہ تو کچھ بھی نا ہوا نا؟ کیا کوئی بھی کسی چیز کو اس سے زیادہ جان سکتا ہے جتنا اس کو بنانے والا اسے جان سکتا ہے؟ پھر لڑکے اور لڑکیاں اپنی فیلنگز کو کیوں ضائع کرتے رہتے ہیں؟؟ یہ تو وہ عمر ہوتی ہے جب ہم چھوٹی چھوٹی باتوں اور تجربات سے دنیا کا امیج بنا رہے ہوتے ہیں اپنے ذہن میں۔ جو ہمیشہ رہتا ہے۔ پھر ہم ساری زندگی دنیا کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کے شادی کے رشتے میں بھی اب محبت نہیں رہی۔ ہم نے محبت کے لفظ کو ہی غلط جگہ پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

ان باتوں کا اندازہ خود اسے بھی بہت دیر سے ہوا تھا۔ اس کا دل پھر سے اداس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ سب لوگوں کو یہ بات سمجھانا چاہتی تھی۔ وہ محبت کو لوگوں کی نظر میں انمول چیز دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کے لوگوں کو کیسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ جو پتھروں اور ہیروں میں فرق کرنا بھول گئے ہیں۔ وہ پتھروں کو چنتے چنتے ہیروں کی قدر کو بھول چکے ہیں۔۔۔

طنز و مزاح

58 میری یونیورسٹی۔ میری جنت
الطاف حسین

60 بڑھتی آبادی
محمد آصف نذیر

62 رابطے
اسد اللہ زاھد

64 ہاسٹل
حسن سرفراز

67 الطاف بھائی!
الطاف حسین سیوڑا

69 ہاسٹل میں پڑھنا
محمد امجد اقبال

72 ناک
محسن رضا

74 امتحان اور طالب علم
رضوان علی حیدر

76 کنفشن پیجز
نفیسہ بی بی

78 سروے
ذیشان خالق چودھری

میری یونیورسٹی۔ میری جنت

الطاف حسین (اول، تحریری مقابلہ)
12-CE-41

جنت ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہر طرف امن وسکون، ہر طرح کی سہولیات میسر ہوں۔ ہر طرف گھنے اور خوبصورت سایہ دار درخت ہوں۔ٹھنڈے پانی کی فراوانی ہو وغیرہ وغیرہ

یونیورسٹی میں جانا اور وہاں پڑھنا۔ نالائق اور کاہل طالب علم کی زندگی کا ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں آ کے ایسے طالب علم جنت جیسی زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یونیورسٹی ایک ایسی جنت ہے۔ جس میں ہر طرف سستی اور کاہلی اور آرام طلبی کا غل غباڑہ ہوتا ہے۔ ایسے اوقات بہت کم ملتے ہیں۔ جب انسان جاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری یونیورسٹی بھی ایسی تمام سہولیات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ خیر اس جنت میں چند ایک چیزیں بالکل ناپسند ہیں۔ مثال کے طور پر حوز نام کی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ہر قسم چڑیلوں کی جان بخشی کر کے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا میں ڈال دیا گیا ہے اور یہ تھکی ہوئی روحیں بھی احساسات وجذبات سے تقریباً عاری ہیں اور اس جنت کے لواحقین کو ان تک رسائی نہیں ملتی۔

یونیورسٹی کو جنت سے تشبیہہ دیکر میں دیہاتیوں کی شرافت اور ایمانداری کا قائل ہو گیا ہوں۔ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو نیک اور ایماندار ہوں گے۔ یہی حال یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا کا بھی ہے۔ لڑکوں کی تعداد کا بیشتر حصہ جنوبی پنجاب کے پینڈوں کا ہے۔ یہ دیہاتی روزانہ صبح سویرے بغیر نہائے شب خوابی کے لباس میں جیسے رات کو سوئے تھے ویسے ہی بڑے بڑے منہ کھولتے اور بند کرتے ہوئے کمرہ جماعت میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور اپنی نیند کا بقیہ حصہ وہاں پر پورا کرتے ہیں۔ چونکہ یونیورسٹی ایک جنت اور انہیں کوئی غم اور خوف نہیں ہے اور نہ ہی کوئی انہیں منہ دھونے اور نہانے جیسے نامعقول کام کہہ سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنا یہ طرزِ زندگی بدلنے سے قاصر ہیں۔

ہماری اس جنت میں ٹھنڈے پانی کی کوئی گنجائش نہیں گرمیوں میں گرم پانی پیو اور سردیوں میں یخ بستہ ٹھنڈا پانی پیو تازہ پانی کہیں سے نہیں ملے گا۔ ایسے لگتا ہے کہ شاید ہمیں کولڈ بلڈڈ بنانے کی تربیت دی جا رہی ہے یا پھر آرمی کے کمانڈوز کی طرح سخت حالات کو برداشت کرنے کی مشقت کرائی جا رہی ہے۔ اور جہاں کہیں پانی کا کولر دستیاب ہے وہاں پر گلاس غائب ہے یا پھر گلاس چھوٹی سی مضبوط سی رسی سے بندھا ہوا ہے۔ یہ رسی اتنی چھوٹی ہے کہ نہ تو آدمی بیٹھ کے پانی پی سکتا ہے اور نہ بڑے قد والا آدمی مکمل طور پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ بس کسی حد تک ایڈجسٹمنٹ کرنی پڑتی ہے۔ جنت کے دروازوں پر دربانوں کے بارے میں سنا تھا اور وہ خوش مزاج ہوں گے۔ لیکن ہماری یونیورسٹی کے دروازوں پر عمر گزیدہ آرمی کے سپاہی کھڑے ہیں۔ جو اپنی عمر کی وجہ سے اتنے چڑچڑے ہو گئے ہیں کہ خوش مزاجی سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اور دوسرا ان کے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس سے یہ لوگ یونیورسٹی کا نہیں تو کم از کم اپنا دفاع ہی کر سکیں۔

ہماری اس جنت میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب شور شرابا نہ ہو رہا ہو۔ اس جنت کے مکینوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہر وقت اپنے منہ

سے بلی، گیدڑ اور دوسرے مختلف اقسام کے جانوروں کی آوازیں نکالیں۔ رات کو دیر گئے جب سب دوست باہر نکلتے ہیں تو اچانک ایک آدمی لمبی سی آواز نکالتا ہے اور جب وہ آواز رات کو سناٹے میں کہیں دم توڑ رہی ہوتی ہے تو دوسرا آدمی فوراً ہی زبان جیسی نعمت کو کام میں لاتا ہے۔ اور بے لگام آواز لگا دیتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد آوازوں کا لامتنائی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر آس پاس کے کتے اور گیدڑ بھی مقابلے پہ اتر آتے ہیں۔ سخت مقابلے کے بعد جیت پھر بنی نوع انسان کی جنس ''طالبعلموں'' کی ہوتی ہے۔

یونیورسٹی جیسی جنت میں چند سر پھرے افراد پڑھائی کا ذکر کر کے ماحول کو افسردہ اور غمگین بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ذرہ بھر بھی خیال نہیں ہے کہ یہ پھول ورگے چہرے جب ''پڑھائی'' کا لفظ سنتے ہیں تو ان کے دل پر گراں گزرتی ہے۔ خوشیوں کی پتنگ پڑھائی کا لفظ آتے ہی اپنا دھاگہ توڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ اور پھر غضب تو اس وقت ہوتا ہے۔ جب نتیجہ آتا ہے اور پھولوں پر کچھ دنوں کے لئے خزاں آوارد ہوتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ اب یہ جنت نہیں رہے گی بلکہ واقعہ یونیورسٹی بن جائے گی جہاں ہر آدمی تعلیم سے محبت کرے گا۔ لیکن سوچنے والوں کا خیال خام ثابت ہوتا ہے اور نتیجہ کے ایک ہفتہ بعد وہی زندگی اور اس کی رونقیں لوٹ آتی ہیں۔ البتہ ایک اور نعرہ آجاتا ہے کہ GPA سے کچھ نہیں ہوتا۔

سنہری باتیں

۵۶۔ جس طرح اکثر بیماریاں طب کی ترقی اور ڈاکٹروں کے ساتھ آئی ہیں، بہت سے جرائم بھی ضابطہ تعزیرات اور وکیلوں کے ساتھ آئے ہیں۔

۵۷۔ کیا مرد سست اور بے سلیقہ ہوتے ہیں؟ ہمارے اس اختلاف یا اتفاق کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عمومی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔

۵۸۔ یہ مسئلہ بہت سے گھروں کا ہے کہ مرد لوگ گھر کی صفائی، چائے بنانے، برتن دھونے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کے بیویاں عاجز آجاتی ہیں۔

۵۹۔ درسی کتابیں پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے جوشاندے پینا۔

۶۰۔ ادیب بنانے کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔ ایک قلم، ایک دوات اور کچھ کاغذ (آلڈس ہکسلے)

۶۱۔ آپ کی عمر کیا ہے؟ ہمارا اندازہ زیادہ غلط بھی نہیں ہوتا۔ معاف فرمائیے۔ یہ سوال آپ سے نہیں ہے۔

۶۲۔ ایک خاتون سے پوچھا پانچ سال پہلے بھی آپ تیس برس کی تھیں، اب بھی تیس برس کی ہیں۔ بولیں ''انسان کی ایک زبان ہوتی ہے!'' (ابن انشاء)

۶۳۔ خلق خدا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر، بیمار اور تیماردار۔

۶۴۔ ہمارے ہاں تحقیق اس قسم کی ہوتی ہے کہ میر تقی میرؔ کونسی دال پسند کیا کرتے تھے اور مصحفیؔ کے پاجامے کو کتنا کپڑا لگتا تھا۔

بڑھتی آبادی

محمد آصف نذیر
12-ENV-47

دس ہزار قبل مسیح دنیا میں دس لاکھ انسان بستے تھے۔ یہی تعداد پانچ ہزار سال بعد پانچ گنا تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت دنیا میں دو کروڑ نفوس جی رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس آبادی میں انتہائی زبردست اضافہ ہوا۔ 2013ء تک یہ آبادی 7 ارب 14 کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اگر آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہے تو چند ایک صدیوں کے بعد اس دنیا میں انسانوں کے رہنے کے لئے شاید کوئی گنجائش نہ رہے۔

سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں۔ ہر دن میں چوبیس گھنٹے، ہر گھنٹے میں ساٹھ منٹ اور ہر منٹ میں تقریباً 14 بچے اس کائناتِ رنگ و بو میں آنکھ کھولتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کی طرح ہمارے ملک کی آبادی بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اٹھارہ کروڑ آبادی والے اس ملک کا گنجان آباد ممالک کی فہرست میں ساتواں نمبر ہے۔ جس شرح سے پاکستان کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ انشاء اللہ عزوجل جلد ہی ہم اس فہرست میں سب سے اوپر آجائیں گے۔

ہمارے ہاں محکمہ فلاح و بہبود آبادی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ جو لوگوں میں شعور پیدا کر رہا ہے کہ وہ اتنے بچے پیدا کریں۔ جن کو وہ بہتر انداز میں تعلیم، لباس، خوراک اور دوسری بنیادی ضروریات میسر کر سکیں۔ اس ادارے میں ابھی تک ''بچے دو ہی اچھے''، ''مختصر خاندان خوشحالی کا نشان'' کی طرح کے نعرے ہی بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور فائدہ نظر نہیں آتا۔ بعض افراد اس محکمے کو محکمہ کنٹرول آباد بھی کہتے ہیں اور اسکی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس محکمہ کا کام بچے کنٹرول کرنا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ والدین کو کنٹرول کریں بچے خود بخود کنٹرول ہو جائیں گے۔

''محکمہ کنٹرول آبادی نا فعالی میں میں ''محکمہ پُلس'' سے بھی آگے بڑھ چکا ہے'' میرے ایک دوست (جن کے والد محکمہ پولیس میں ہیں اور وہ ایک درجن بھائی بہن ہیں) نے صورت حال کو اس طرح واضح کیا:

اِدھر ناکے پہ ناکا ہو رہا ہے
اُدھر ڈاکے پہ ڈاکا ہو رہا ہے
اُدھر منصوبہ بندی کا ہے چرچا
اِدھر کاکے پہ کاکا ہو رہا ہے

خبر ہے کہ وطن عزیز میں ایک محترمہ نے بیک وقت چھ بچوں کو جنم دیا ہے۔ ماشاء اللہ ماں اور بچے خیریت سے ہیں۔ باپ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے امید ہے وہ بھی خیریت سے ہوں گے۔ اگر پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک میں ہوتے تو اب تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے اور ملک بھر میں اس چیز پر پابندی لگا دی جاتی جس سے "Papolution Technalogy" میں اس قدر اضافہ ہوتا ہے۔

ہمارے ہمسائے ملک چین میں ایک قانون بنایا گیا تھا کہ والدین صرف ایک بچہ پیدا کر سکیں گے۔ بصورت دیگر سزا کے حق دار ہوں گے۔ پندرہ سال تک یہ قانون نافذ رہا ہے اور شرح آبادی کو کم کرنے میں کافی موثر رہا ہے۔ مگر اب یہ قانون ختم کر دیا گیا ہے۔ خاص ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے

حکومتی عہدیداران کے ہاں جڑواں مہمان آنے والے ہیں۔ تیزی سے بڑھتی آبادی کی دو اہم وجوہات درج ذیل ہیں:

ا۔ شادی شدہ مرد

ب۔ شادی شدہ خواتین

محکمہ کنٹرول آبادی کا کہنا ہے کہ آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے انہوں نے واپڈا سے خصوصی مدد حاصل کی ہے اور لوڈ شیڈنگ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شادی شدہ لوگ بے چارے مشکل میں ہیں مہنگائی میں دو بچوں کی تعلیم و تربیت، صحت اور دیگر اخراجات کو پورا کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے بقول شاعر:

عمر بھر صحرا نوردی کی مگر شادی نہ کی
قیسؔ دیوانہ بھی تھا بڑا سمجھ دار آدمی

سنہری باتیں

۶۵۔ کسی کا ٹیچر بننا بجائے خود عمر بھر کے لئے بھوک ہڑتال پر چلے جانا ہے۔

۶۶۔ ایک صاحب نے پی آئی اے کے لئے ماٹو تجویز کیا ہے، تو مرغی ہے، پرواز ہے کام تیرا۔

۶۷۔ یہ امریکہ والے چاند پر کیا پہنچے، ان کا دماغ ہی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ راکٹ وغیرہ کا کیا کھڑاگ ہے، بات تب تھی کہ پیدل پاؤں جاتے۔

۶۸۔ چاند کے سلسلہ میں ریسرچ کا سب سے پہلا ادارہ پاکستان میں بنا جس کا نام ہے ''رویتِ حلال کمیٹی''۔

۶۹۔ فی زمانہ حکومت بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں۔ ایک بیلٹ یعنی الیکشن کا، دوسرا بلٹ یعنی گولی کا۔

۷۰۔ اگر مغلیہ دور میں بھی الیکشن ہوتے تو اکبر اعظم نامزدگی کا فارم بھی ابوالفضل کو پُر کرنے پڑتے کیونکہ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔

۷۱۔ ہمارے ہاں مرحوم کی قدر اُسکے مرنے کے بعد ہوتی ہے۔

۷۲۔ گراگری کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آزادانہ پیشہ ہے۔

۷۳۔ ہمارے ملک میں زیادہ نہیں تو سال میں ایک ماہ ضرور مارشل لاء لگنا چاہیے تاکہ گلیاں صاف ہو جائیں اور سڑکوں کی مرمت ہو جائے۔

”رابطے“

اسداللہ زاہد
12-EE-29

ابتداء سے ہی انسان دوسرے انسانوں سے روابط قائم رکھنے کے لئے مختلف ذرائع کا استعمال کرتا رہا ہے۔جیسا کہ کبوتر خطوط وغیرہ اور آجکل کے دور میں،ٹیلیفون،موبائل اور انٹرنیٹ وغیرہ۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب لوگ خط لکھا کرتے تھے۔ ہر گاؤں میں ضرور ایک ایسا لڑکا ہوتا تھا۔جو اُردو لکھنا پڑھنا جانتا تھا،اور گاؤں کی عورتیں اپنا خط ،چھٹی لیکر اُس کے پاس آبرا جمان ہوتی تھیں کہ پڑھ کے بتاؤ اس میں کیا لکھا ہے۔

اُس دور میں نوزائیدہ محبتیں بھی خطوط کے تبادلے سے پروان چڑھتی تھیں اور یہ خط ڈاک کے ذریعے نہیں بلکہ لکھنے والا خود اپنی محبوبہ تک پہنچاتا تھا۔ یہ خط حویلی کی دیوار پر رکھا جاتا تھا۔یا پھر اس کام کے لئے کسی چھوٹے بچے کا سہارا لیا جاتا تھا۔اور اس بچے کو اس کام کے لئے ایک دو روپے یا ٹافی دیکر منا لیا جاتا۔

ان خطوط میں مختلف اشعار بھی لکھے جاتے۔بعض اوقات محبوب کے دل کو محبت کی کھیتی کیلئے زرخیز کرنے کے لئے خون سے خط لکھا جاتا۔اب یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ خون ککڑ کا ہوتا تھا یا بکرے کا۔ایسا ہی ایک خط میری نظر سے گزرا جس کے لفافے پر لکھا تھا کہ

طوطا بولے ! مینا بولے !
ارشد کے سوا کوئی نہ کھولے

کیونکہ ارشد کے سوا کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔لہذا ہم اُسے کھولنے کی جراءت نہیں کر سکے اور رہیں دل کی دل ہی میں حسرتیں۔۔ایک کم سن دوشیزہ کا اپنے سنگ دل محبوب کے نام خط کا متن کچھ یوں تھا۔

ڈبے میں ڈبہ ڈبے میں کیک
میرا اسلم لاکھوں میں ایک

”اسلم آج کل تم ہماری گلی میں سے دودھ لینے کے واسطے نہیں گزرتے اور دو دن سے سیپارہ پڑھنے مدرسے بھی نہیں آرہے تم مجھے بھول تو نہیں گئے۔I Love you! I Love you! تم پینٹ شرٹ میں بہت اچھے لگتے ہو۔۔۔۔۔
عطر کی بوتل پتھر پہ مار کر توڑ دوں گی
مجھے اسلم نہ ملا تو جینا ہی چھوڑ دوں گی“

اُس دور میں ایسے عشقیہ خطوط کے رواج کا منہ بولتا ثبوت یہ گانا ہے:

چھٹی زرا سیاں جی کے نام لکھ دے
حال میرے دل کا تمام لکھ دے

(یہ گانا تو آپ نے بھی سُن رکھا ہوگا۔اسی طرح گاؤں کی اَن پڑھ بیویاں بھی اپنے پردیس میں نوکری کرتے شوہروں کو خط لکھواتی تھیں۔)ایسا ہی ایک خط دیکھئے:

''پپو کے ابا! السلام وعلیکم! ہم سب ٹھیک ہیں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ آپ نے جو پیسے بھیجے تھے وہ پپو کی سکول کی فیس اور چھوٹو کی دوائی پر خرچ ہو گئے ہیں۔ بجلی اور گیس کا بل آ چکا ہے اور میرے چچا جو کانپور میں رہتے ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے کی شادی ہے اور میرے پاس ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں۔ آپ کی امی جو رشتے میں میری ساس لگتی ہیں ہر وقت طعنے دیتی ہیں کہ میں پیسے میکے بھیجتی ہوں۔ میں انہیں ایک لفظ تک نہیں کہتی اور پھر ہمیں محلے والے چھڑاتے ہیں۔ خط ختم ہوا'' آجکل محبتیں اور بیویوں کے مسائل تو ویسے ہی ہیں لیکن خطوط کی جگہ Social websites اور Mobile Messaging نے لے لی ہے۔

جب بھی اکیسویں صدی کے کسی گھر میں کھانا بنتا ہے تو بیٹا ماں کو نہیں کہتا کہ کھانا اچھا تھا۔ بلکہ کھانے کی تصویر Facebook یا دوسری اسی قسم کی Social Sites پر Upload کر دی جاتی ہے اور بیٹا Status میں یہ لکھتا ہے۔

"Love you Mom

Kia Biryani thi

Maza Aaa Gya!"

اور پھر ممی وقت نکال کر اس Status کو Like کرتی ہیں۔ انٹرنیٹ سے شغف تو مجھے بھی ہے۔ اور درجنوں سائٹس پر کافی وقت گزاری کرتا ہوں۔ لیکن مجھ پر میری علمیت کا راز اس وقت افشاں ہوا۔ جب ایک آنٹی نے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں مجھ سے کہا کہ بیٹا Viber پر اکاؤنٹ تو بنا دو۔ اب مجھے یہ تک نہیں پتہ تھا کہ Viber کس ڈش کا نام ہے۔

ٹھٹھکتے ہوئے میں نے کہا کوئی مسئلہ نہیں بتائیں تو کہاں ہے آپکا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ۔ آنٹی بولی بیٹا انٹرنیٹ تو اسی پہ ہے۔ (اسی اثناء میں آنٹی نے Galaxy S4 نکالا)

میں موبائل پکڑ کر دو منٹ تک یہی سوچتا رہا کہ اس کے بٹن کہاں ہیں۔۔۔۔ اس سے میں نے یہی اخذ کیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ آنٹیاں بھی بدل چکی ہیں۔

میرا ایک دوست جو دو ماہ سے مجھ سے ناراض تھا۔ وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کہ میں نے اس کی Profile Pic کو Like نہیں کیا۔

انٹرنیٹ نے دنیا کو Global Village تو بنا دیا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ بھائی کو بہن سے اور بیٹے کو ماں سے جدا کر دیا ہے۔ سمندر پار رشتہ دار تو قریب آ گئے ہیں۔ لیکن اپنے ہی گھر میں بسنے والے Social Media کی گہما گہمی میں کہیں کھو گئے ہیں۔

ہاسٹل

حسن سرفراز
11-IE-47

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم کسی ہاسٹل میں گھوم رہے تھے۔ گھوم رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے، ہنس رہے تھے اور ہنس ہنس کے ہلکان ہو رہے تھے۔ ایک بالکل الگ وضع کی زندگی ہمارے سامنے تھی جو ہماری حیرانی کا سبب تھی اور کمروں کے دروازوں پر ہاسٹل کے باسیوں کے لکھے جملے ہمیں ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اگرچہ ہنسنا ہم ایسوں کے نصیب میں کہاں ۔۔۔! زمانے نے کچھ ایسے ستم ڈھائے ہیں کہ اب ہم ہنستے نہیں، قہقہے لگاتے ہیں، بُلند بانگ اَور برہنہ قہقہے!

ایک شاعر مزاج دل جلے نے اپنے دروازے پر غالباً نشے کی حالت میں تحریر فرمایا تھا: ''دستک درِ زنداں پہ ذرا آہستہ مری جاں!''

ایک دروازے پر یہ اطلاع درج تھی۔ ''آگے کام ہو رہا ہے۔ تکلیف کے لئے معذرت خواہ ہیں۔''

ایک پہلوان نے تنبیہہ کی تھی۔۔ ''یاد رکھئے! اندر داخل ہونے کے بعد اپنی حفاظت کے آپ خود ذمہ دار ہیں۔''

ایک تحریر یہ تھی کہ۔۔ ''براہِ کرم! اوکھلی میں سر نہ دیں۔ شکریہ''

ایک دروازے کی تحریر یہ مژدہ سُنا رہی تھی۔۔ ''خوشخبری! اُبلے انڈے دستیاب ہیں۔ کالا نمک اور مرچ فری''

اُس وقت اُس ہاسٹل میں گھومتے ہوئے ہمارے جی میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش ہم بھی کسی ہاسٹل میں قدم رنجہ ہوں۔ خدا تعالیٰ ہمارا انجام اچھا کرے، آج عرصہ اڑھائی سال سے ہم ہاسٹل کی اسی البلی چنچل زندگی کا حصہ ہیں اور ہم نے اپنے کمرے کے دروازے پر ''خطِ منحنی'' میں میرؔ کا یہ شعر درج فرمایا ہے:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

ہاسٹل کی زندگی واقعتاً بڑی لاپرواہ ہے، بے فکر اور لا اُبالی۔ لڑکے یہاں گھروں سے روتے ہوئے آتے ہیں اور پھر اس زندگی میں ایسے مدغم ہوتے ہیں کہ گویا بھول جاتے ہیں کون ہیں۔۔؟ کہاں سے آئے ہیں؟ خود ہم شروع میں رات کو سو نہ سکتے تھے۔ کیونکہ گھر کی یاد ستاتی تھی اور اب حال یہ ہے کہ گھر اور گھر والے اُس وقت یاد آتے ہیں جب جیب خالی ہو جاتی ہے۔ خدا اتنا بے وفا کسی کو نہ کرے!

یہاں اپنی مرضی کے آپ خود مالک ہیں اور اپنے کیے کے خود ذمہ دار ہیں کوئی آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے معمولات میں مخل نہیں ہو سکتا۔ نہ آپ کے معاملات میں ٹانگ اڑا سکتا ہے۔ نہ آپ کو کسی کام سے روک سکتا ہے، نہ آپ کو کچھ نصیحت وغیرہ کر سکتا ہے ۔ چنانچہ آپ کی طبیعت اگر فاقہ کرنے چاہ رہی ہے تو ایک وقت کا کھانا موقوف کیجئے' دو وقت کچھ نہ کھائیے' بلا سے پورا مہینہ کچھ نوش نہ فرمائیے' کس مائی کے لال میں جراءت ہے کہ آپ کو احساس دلائے اور کچھ کھانے کو کہے۔ اسی طرح اگر آپ پرسکون استراحت فرمانا چاہتے ہیں تو بستر میں دھر کے سو رہیے۔ پھر جب تک جی چاہے سوتے رہیے۔ کسی کی کیا مجال جو آپ کو جگانے کا گناہ اپنے سر لے۔ چنانچہ انہی آزادیوں کا فائدہ اُٹھا کر ہم نے مولی کو چائے

میں ڈبو کر کھانے کے مزے اُڑائے ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی دو پہروں میں گرما گرم کافی کے لطف لئے ہیں۔ سردیوں کی راتوں میں لسی کے جام پیئے ہیں۔ سخت جاڑے میں فقط ایک جانگئے میں گھومے ہیں۔ جون جولائی میں رضائی لے کر سوئے ہیں۔ اور یقین مانئے! کبھی کسی نے ہمیں روکا ٹوکا نہیں۔ دراصل یہی وہ آزادیاں ہیں جو لڑکوں کو ہاسٹل کی طرف کھینچتی ہیں ہیں۔ ہاسٹل میں آپ کا کمرہ آپ کی جائے پناہ ہے۔ اسے آپ اپنا قصرِ حکومت، محل سرا اور جاگیر وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جگہ ہے جہاں آپ خود کسی کے علاوہ کچھ بھی کر سکتے ہیں مثلاً گا سکتے ہیں، قوالی کر سکتے ہیں، ریاضی کی مشق فرما سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ دھمال بھی ڈالنا چاہیں تو شوق سے ڈالئے۔ ہم کہ خدا تعالی نے گانے کا ذوق عطا کیا ہے' فارغ اوقات میں جی بھر کر اپنی آواز کا جادو جگاتے ہیں' ورنہ گھر میں ہمیں اسکی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے لے بیچ میں کچھ ڈگمگا سی جاتی تھی اور سامعین خصوصاً ہماری والدہ کو سُر کچھ بھلا معلوم نہ ہوتا تھا۔۔ اب ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اب تو مسلسل مشق کی برکت ہے ہم جو کبھی موج میں آ کر دھما چوکڑی بھی مچائیں بھی تو ایسا ربط پیدا کرتے ہیں کہ وہ صوفیوں کا رقص معلوم ہوتی ہے۔

ہاسٹل میں رہتے ہوئے بعض ضرورت کی اشیاء آپکے کمرے میں موجود ہونا از حد ضروری ہے۔ مثلاً کنگھی، شیشہ، استری، صفائی کا برش، شُو پالش وغیرہ۔ بدقسمتی سے ہمارے کمرے میں ان میں سے ایک بھی چیز موجود نہیں۔ چنانچہ اپنی زلفوں کو سنوارنے کے لئے ہم اپنے دائیں جانب والے پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور کپڑے استری کرنے کے لئے بائیں جانب والے پڑوسی سے رجوع کرتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی بہت اچھے اور سخی طبیعت کے لوگ ہیں۔ کبھی نہ نہیں کرتے، جانتے ہیں 'نہ' کریں گے تو صبح صبح صابن اور شیمپو کس سے مانگیں گے؟؟

چھٹی والے دن کے علاوہ صبح کا سورج ہاسٹل میں ہر روز ایک افراتفری اور ہڑبونگ کا بگل بجا کر طلوع ہوتا ہے۔ صبح کے سہانے وقت سے لطف اندوز ہونے والے صرف وہ سحر خیز ہوتے ہیں جو ہاسٹل کی اصطلاح میں ہر شام سو جاتے ہیں۔ انہی خوش قسمتوں کو غسل خانوں میں پانی گرم ملتا ہے اور یہی وہ نادر مخلوق ہے جو وقت کی پابند کہلاتی ہے۔ ورنہ جو راتوں کو جاگتے ہیں۔ اُلوؤں سے مقابلے لگائیں وہ کیونکر جلدی اُٹھیں؟ ایسے لوگ کبھی سورج کو طلوع ہوتا دیکھ لیں تو اپنی قسمت پر رشک کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ہم ایسے لڑکے کلاسز شروع ہونے سے آدھا گھنٹا قبل بمشکل اپنے بستروں سے نکلتے ہیں۔ اور پھر صابن اور تولیہ ڈھونڈ کر غسل خانوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ جہاں صورتحال یہ ہوتی ہے کہ چند لڑکے جو ہم سے کچھ لمحے پہلے تشریف لے آئے تھے۔ اب واش رومز پر 'پہلے آؤ، پہلے پاؤ' کی بنیاد پر قابض ہیں اور باہر لائن میں لگے لڑکوں کی ہزار التجاؤں' درخواستوں' گزارشوں اور دھمکیوں کے باوجود یہ قبضہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جب یہ معمہ کسی طور پر حل نہیں ہوتا تو ایک لڑکا بے صبری اور بے چینی کے عالم میں زور زور سے برش دانتوں پر رگڑتے ہوئے ایک واش روم کے دروازے پر زوردار لات برساتا ہے اور پھر چلاتا ہے۔ ''سو گیا ہے کمینے؟ اب نکل بھی آ!'' اس پر اندر سے گھٹی گھٹی سی آواز میں جواب برآمد ہوتا ہے۔ ''آیا بھائی! بس دو منٹ!'' یہ اس بات کی نوید ہے کہ اگلے آدھے گھنٹے میں کسی وقت آپ کی باری بھی آ جائے گی۔ الغرض اس وقت کوئی کتنی بھی

جلدی کیوں نہ دکھالے، کلاس میں کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔ نتیجہ یہ کہ کلاس میں داخل ہوتے ہی پروفیسر دیر سے آنے پر واپس باہر کی راہ دکھا دیتا ہے۔ عقلمند لڑکے اس تنبیہہ سے سبق سیکھتے ہیں۔ یعنی اگلے دن وقت پر آنے کا تہیہ کر کے کمرے میں جا کر پھر سو جاتے ہیں۔

ہاسٹل میں کھانا کھانے کی جگہ کو ''لنگر خانہ'' کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے ''میس ہال'' کہیے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں روزانہ سینکڑوں مرغیاں اپنی جانوں سے جاتی ہیں۔ لیکن کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ اور جہاں کھانوں کے ذائقوں اور مزوں کو یکسانیت کے ایک نقطے پر مرکوز کیا جاتا ہے۔ یعنی سبزیوں، دالوں اور گوشت کے نسلی امتیازات کو مٹایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہاسٹل کے میس میں ہمیں مونگروں کی بُھجیا میں چنے کی دال کا ذائقہ ملتا ہے اور چنے کی دال میں مرغ کے قورمے کا مزہ محسوس ہوتا ہے۔ مرغ کے قورمے کو صرف پہچان میں آسانی کے لئے قورمہ کہتے ہیں۔ ورنہ دراصل یہ مونگروں کی بُھجیا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اوپر ذکر کئے گئے تمام کھانوں کا مجموعی ذائقہ ہم بریانی اور پلاؤ میں محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ بریانی اور پلاؤں بہن بھائی ہیں۔ یک ذائقہ دو نام ہیں۔

ہم جب اپنا گھر چھوڑ کر آئے تھے تو یہاں اور وہاں کی چیزوں میں کوئی غیر معمولی فرق ہمیں نظر نہیں آیا تھا۔ مثلاً یہاں کا کھمبا ویسا ہی ٹیڑھا تھا، یہاں کی بلی ویسی ہی کھسیانی تھی، حد یہ کہ یہاں کی روٹی بھی ویسی ہی چکور تھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں اچھے لڑکے کی طرح واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہم یہاں کے کھانوں میں تبدیلی دیکھنے کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ لیکن جب یہ خیال بھی خام ثابت ہوا تو ایک دن ہم میس کے باورچی کے روبرو پیش ہوئے جو اُس وقت اپنی عظیم توند جیسی عظیم دیگ میں اپنے قد سے دوگنا بڑا بیلچہ گھمانے میں مصروف تھے۔ ہم نے اجازت پا کر دست بستہ اپنی شکایت پیش کی تو انہوں نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔ بولے ''ندیدو چٹخورو! ہم لوگ جتنی بھی کوشش کرلیں کہ تمہیں گھر سے دوری کا احساس نہ ہو، جتنے بھی مصالحے ڈال لیں، جتنا بھی اچھا پکا لیں۔ تمہیں پھر بھی شکایت ہی رہتی ہے۔ جاؤ لگا دو جس سے لگانے ہے میری شکایت۔ R.T صاحب بھی میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتے ہیں۔''

ہم اُنہیں بتا نہ پائے کے گھر سے دوری کا ہمیں قطعاً کوئی احساس نہیں ہے کیونکہ مرغی یہاں کی بھی دال برابر ہے اور سبزی بھی ہمیں یہاں کی کبھی اچھی نہیں لگی۔ یہاں کی دال کھا کر ہمارا اب بھی بھوک ہڑتال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہمیں ہاسٹل کے نوٹس بورڈ پر لکھا وہ جملہ اب تک یاد ہے جو ہم نے یہاں اپنے نزول کے پہلے دن پڑھا تھا۔ ''ہمارا نصب العین! طلباء کو گھر سے دور گھر جیسا ماحول میسر ہو۔''

اس جملے کا سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ ''پانی کبھی گرم نہ ملے گا اور کھانا ایسا ہوگا کہ بس زندہ رہنے کو زہر مار کیا جائے۔''

الطاف بھائی!

الطاف حسین سیوڑا
12-CE-41

آج کل ایک مصیبت بن بلائے مہمان کی طرح میرے گلے سے لپٹ گئی ہے۔ اور سمجھ نہیں آتی اس سے جان چھڑانے کے لئے گدڑ سنگی کہاں سے لاؤں۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں سے وہ بندہ تلاش کروں جس نے سب سے پہلے 'یو ای ٹی' میں سینئرز کو ''بھائی'' کہنے کی روایت ڈالی تھی۔ خیر اسے تھوڑی ہی میری مشکلات کا اندازہ تھا۔ جو جونیئر ملتا ہے۔ دوگز کی زبان نکال کر بولتا ہے ''الطاف بھائی!'' وہ بیچارہ تو رٹا رٹایا بھائی بول دیتا ہے۔ لیکن یہاں میرے دل و جان کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔

کسی بھی نئے آدمی کو اپنا تعارف کراتا ہوں تو وہ ایک نظر میں مجھے سر سے پاؤں تک گھورتا ہے۔ گویا میرے زورِ بازو کا اندازہ لگاتا ہے۔ پھر جب اسے میری جسامت اور قد کاٹھ پہ یقین آجاتا ہے کہ بندہ شریف ہے اور لڑائی کا رسک (Risk) تو کبھی نہیں لے گا۔ اور اگر رسک لے بھی لے گا تو ہڈی پسلی تڑوا کے ہی جائے گا۔ اس کے بعد وہ آرام سے اپنا چشمہ درست کرتا ہے۔ اور پھر شرارتی انداز سے کہتا ہے ''الطاف بھائی!'' اور پھر کیا ہوتا ہے۔ مجھے اس کی کبھی کبھی۔۔۔ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا پیٹ ہنسنے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ تو زخموں پر نمک یہ کہہ کر چھڑکتا ہے ''الطاف بھائی! آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟

کسی محفل میں یا کلاس میں کسی نے اپنا نام زبان کی نوک پہ لایا۔ لوگوں نے ہنسنے کے لئے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیا اور ساتھ ساتھ کلاس میں نامعلوم مقامات سے ''بوری تیار کرو'' ''بھتہ وصول کرو'' کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر سب کے سب یک زبان ہو کے بولتے ہیں ''الطاف بھائی'' کوئی پوچھتا ہے۔ لندن سے کب آئے وغیرہ وغیرہ

کچھ جوشیلے اور مسخرے تو نعرہ بھی لگاتے ہیں۔ ''سب کا بھائی ،الطاف بھائی'' جو کہ بہت ہی نامعقول بات ہے۔ اگر وہ نعرہ لگاتے ہی ہیں تو ''سب بھائیوں کا بھائی'' ہی کہہ دیں۔ سب کا بھائی تو نہ بنائیں نہ آخر میرے بھی کوئی جذبات ہیں۔

چلیں یہ تو مذاق کرتے ہونگے۔ جو بندہ کسی نہ کسی طرح پی جاتا ہے۔ لیکن ایک دن ناقابل فراموش واقعہ پیش آیا۔ جب میں اپنا چیک اپ کرانے ہسپتال پہنچا تو ڈاکٹر صاحبہ کو اپنا نام بتایا وہ تو میرا نام سنتے ہی سیخ پا ہو گئیں اور برہم ہو کر بولیں ''خدا کے لئے یہ نام تو بدل لو۔ کتنا خطرناک ہے۔ اُف اللہ'' خاتون کے چہرے کے خدوخال صاف بتا رہے تھے کہ میں فوراً موقعے سے رفو ہو جاؤں۔ اور میرے سامنے ایک حقیقت کھلی اور میں نے مستقبل میں اپنے آپ کو مار کھانے کے لئے بھی ذہنی طور پر تیار کر لیا ہوا ہے۔ اور دل نے صاف الفاظ میں گواہی دی کہ اگر پُتر لندن والے الطاف بھائی کے یہی کرتوت رہے تو وہ وقت دور نہیں جب حکومت کو پاکستان میں بسنے والے باقی ماندہ الطافوں کے لئے سیکورٹی کے سخت انتظامات کرنے پڑیں گے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میرا حال بھی کہیں میرے دادا جیسا نہ ہو۔ میرے دادا محترم کا اصل نام ''غلام محمد'' ہے۔ جو گھر والوں کے علاوہ چند چیدہ چیدہ افراد کو ہی معلوم ہے۔ بچپن سے ہی ان کا عرف

''بھائی'' پڑ گیا۔ اپنے بھانجے، ماما بھائی، بھتیجے چاچا بھائی، حتیٰ کہ اپنے بھائی بھی کبھی کبھی ترنگ میں آ کے کہہ دیتے ہیں ''بھائی بھرا ''میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جا رہا ہے۔ جو کہ سراسر ناانصافی ہے۔ اور میں اس کی مذمت کرتا ہوں۔ اس خیال سے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کہیں میری شریک حیات ہی مجھے یہ نہ کہہ دے ''الطاف بھائی آپ کو بچوں کی کوئی فکر ہی نہیں۔ مُنے کو سکول چھوڑ آؤ''۔

میرا دل چاہتا ہے کہ نام کے ساتھ ہونے والے اس ناروا سلوک کے خلاف مہم چلاؤں اور کوششیں کروں۔ کئی بار فیس بک پہ پیج بنانے کا بھی سوچا۔ لیکن پیج کا نام کیا رکھا جائے۔ تو ذہن میں خیال آتا ہے ''الطاف بھائی'' ہی نام جب پیج کا رکھا جائے تو خاک دوسرے ''الطافوں'' کے ساتھ اظہار یکجہتی ہوگا۔ یہ تو زخم تازے کرنے کے مترادف ہے۔

سنہری باتیں

۷۴۔ سامراجی دور کی چھوڑی ہوئی لعنتوں میں سے ایک ''امتحان '' بھی ہے۔ اس سے منافرت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً طلباء اور محکمہ تعلیم کے درمیان۔

۷۵۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا۔ جس کا دارالخلافہ پہنچاب ہوگا۔

۷۶ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے، وغیرہ وغیرہ۔

۷۷۔ جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے، وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔

۷۸۔ ایک مثل ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔ یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

۷۹۔ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

۸۰۔ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو، جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔

۸۱۔ رزق کی سب راہیں۔ مسدود نظر آئیں تو ناگوار رفتہ رفتہ گوارا ہو جاتا ہے۔

۸۲۔ دیہات میں وقت بھی بیل گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔

۸۳۔ وہ کیسے اچھے زمانے تھے، جب چوری اور بدنیتی کی مثال دینے کیلئے پیروں سے زیادہ لذیذ شے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

”ہاسٹل میں پڑھنا“

محمد امجد اقبال
12-CE-11

ہاسٹل اور پڑھائی کا آپس میں کیا تعلق؟ یہ تو دو ایسے الفاظ ہیں جو بھر پور انداز میں ایک دوسرے کی نفی کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ اسی لئے مضمون کا یہ نام کچھ ایسا ہی غیر حقیقی دکھائی دیتا ہے۔ جسے کوئی داستان یا جیسے کسی حکومت کے پانچ سال پورا کرنے کی خبر ہاسٹل کے طلباء کا من پسند مشغلہ ہر وقت فارغ ہی پڑے رہنا ہے۔ اسی لئے اس مضمون کا نام پڑنا رکھا گیا ہے۔

ہمارے خیال میں ہاسٹل اور ہاسپٹل میں زیادہ فرق نہیں کیونکہ ہاسپٹل میں مریض جبکہ ہاسٹل پہ طالباء بستروں پر پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے پہل تو ہم یہ سمجھتے رہے کہ طلباء کے ہر وقت لیٹے رہنے کی وجہ سستی ہے۔ مگر بعد میں ایک طالب علم کی زبانی پتہ چلا کہ اس کے پیچھے بھی ایک مقصد کارفرما ہے۔ اُس طالب علم نے ہمیں بتایا ”کہتے ہیں بڑا آدمی بننے کے لئے بڑے خواب ہونے ضروری ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ خواب دیکھنے کے لئے سونا ضروری ہے۔ اسی لئے ہاسٹل کے طالباء بڑا آدمی بننے کی کوشش میں دن رات بڑے خواب دیکھنے کی دھن میں ”مست“ رہتے ہیں“۔

ہمارے ایک اور دوست کی بات بھی سن لیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”دیکھئے جی !! اگر ہاسٹل میں بھی پڑھائی کرنی ہے تو حکومت نے یونیورسٹی کیوں بنائی؟ آخر یونیورسٹی کا بھی کوئی مصرف ہونا چاہیے۔“ وہ اس مسئلے پر اتنے جذباتی ہو چکے ہیں کہ عنقریب حکومت کو درخواست دینے والے ہیں کہ یا تو یونیورسٹی ختم کی جائے یا ہاسٹل سے پڑھائی!۔

اب آپ ہی بتایئے جب ہمارے دوستوں کے دلائل اتنے وزنی ہیں تو ہم ان سے متفق کیوں نہ ہوں؟ ہم تو ویسے بھی زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھتے ہیں۔ سو ان سے باہمی یگانگت کے ثبوت کے طور پر ہم بھی پڑھائی سے زرا دور ہی رہتے ہیں۔ مگر ہم ہاسٹل میں اتنا زیادہ نہیں سوتے، آخر لیکچر روم کس مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں؟ ہاسٹل کے طلباء راتوں کو جاگتے اور دن کو سوتے ہیں۔ ہمارے ایک معصوم سے دوست سے کسی نے پوچھا ”آپ کی پیدائش کہاں ہے؟“ وہ بے چارہ ادیبانہ قسم کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”جہاں راتیں جاگتیں ہیں اور دن سوتے ہیں“ سوال پوچھنے وال بڑا غلط تاثر لے کر چلا گیا۔

ہاسٹل نے ہمیں ساری رات جاگنے کی جو عادت ڈالی اس سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ پہلے ہماری امی حضور ہمیں نصیحت کیا کرتی تھیں ”بیٹا! صبح اُٹھ کر فجر کی نماز ضرور پڑھا کرو“

اب کہتی ہیں ”بیٹا سونے سے پہلے فجر کی نماز ضرور پڑھا کرو“ بہر حال چھوڑیئے اس قصے کو اب ہم ذرا ہاسٹل کے غسل خانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ غسل خانے بے شمار گلو کار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر ہاسٹل کے غسل خانے اس لحاظ سے برتر ہیں۔ کہ یہ ادیبوں اور مصوروں کو جنم دینے کی اضافی اہلیت رکھتے اور ان حضرات کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کرتے

ہیں جس پر یہ اپنی فنکاری کے ذریعے بے شمار لوگوں کو تائب کر سکتے ہیں۔ بعض صاحبان تو دیواروں پر اپنے قلم کے ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ کانوں کو ہاتھ لگانے کی شدید خواہش جاگ اُٹھتی ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی اس خواہش پر عمل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اتنے بدبودار غسل خانوں میں کانوں کو ہاتھ لگانے کے لئے کوئی ہوش مند انسان ناک چھوڑنے کا خطرہ بھی تو مول نہیں لے سکتا۔

ہم نے ایک سینئر بھائی سے پوچھا کہ غسل خانے میں مصوری کی ضرورت آخر زیادہ کیوں محسوس کی جاتی ہے؟ وہ بولے ''ہوسکتا ہے کہ آج سے 5 ہزار سال بعد کھدائی کے دوران کوئی ہاسٹل نکل آئے اور اس میں موجود تحریریں بھی صحیح سلامت ہوں، مگر ضروری نہیں کہ اس وقت کے ماہرین تحریروں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ اس لئے تصویروں کی زبان سے یہ نشان چھوڑ جاتی ہے کہ کسی زمانے میں یہ جگہ غسل خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس طرح یہ ہونہار طلباء مستقبل کے ماہرین کی مدد کر رہے ہیں۔''

یہ دلائل سن کر ہمیں UET کے طلباء کی دور اندیشی پر رشک آیا۔

بعض طلباء کو شکایت ہے کہ ہاسٹل کے غسل خانوں میں پانی بہت کم آتا ہے۔ مگر ہمیں ان سے شدید اختلاف ہے کیونکہ یہاں تو اتنا پانی آتا ہے کہ ہفتے کے سات دن گٹر ابلتے رہتے ہیں۔ البتہ جن غسل خانوں کے گٹر ٹھیک ہوں۔ وہ ضروری خشک سالی کا شکار رہتے ہیں۔

ہاسٹل کی واحد چیز جسے (RT) کے چھاپے سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے وہ یقیناً متفقہ طور پر میس بل یعنی کھانے کا بل ہے جسے دیکھ کر طلباء بلبلا اُٹھتے ہیں۔ ہاسٹل میں وہ جگہ جہاں آدمی کو گھر یاد آتا ہے۔ ہاسٹل میس ہے کیونکہ ہاسٹل کے کھانوں میں اکثر اتنے ٹماٹر ڈال دئے جاتے ہیں کہ سالن میٹھا ہوجاتا ہے۔ غالباً منشی صاحب میٹھے کی کمی کو پورا کرنے کے لئے حربہ استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی طلباء کی ہمت کو داد دینی چاہیے کہ وہ ہاسٹل انتظامیہ کا دل رکھنے کے لئے زیادہ کھاتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی حساس قسم کے طلباء ان کا دل رکھنے کے لئے ''سپلی پر سپلی منگواتے چلے جاتے ہیں'' کیونکہ وہ

''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو''

کے قائل ہیں۔ مگر ہاسٹل کے مضرِ صحت کھانے کھا کر اکثر خود دردِ دل کے عارضے میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جو طلباء زیادہ سپلی منگواتے ہیں۔ امتحانوں میں بھی انہی کی زیادہ سپلیاں Supplementaires آتی ہیں۔ لفظ سپلی ہاسٹل میں انتہائی خوشگوار۔ جبکہ رزلٹ کے صفحہ پر انتہائی منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس حاضری لگانا، کلاس میں انتہائی پسندیدہ فعل اور میس رجسٹر میں انتہائی افسوس ناک کام ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ہمیں گھر جانا تھا۔ لہذا اپنے ایک کو کہہ گئے کہ پیچھے سے ہماری حاضریاں لگا دینا۔ واپس آئے تو معلوم ہوا موصوف میس رجسٹر میں ہماری حاضریاں لگاتے رہے ہیں اور عام دنوں سے زیادہ بل کرلیا ہے۔

ہاسٹل کا اخبار عام اخبار سے مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ عام اخبار پر وہی کچھ لکھا ہوتا ہے جو مدیر حضرات چھپاتے ہیں۔ جبکہ ہاسٹل کے اخبار میں چند غیر موزوں تبصرے اور کارٹون بھی شامل ہوتے ہیں۔ جنہیں طلباء مختلف خبروں کے ردِ عمل کے طور پر اخبار کا حصہ بنا ڈالتے ہیں۔ زیادہ تر طلباء یہی تبصرے پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ ویسے اخبار کے گرد اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والا طالب علم

ان کے عشق علم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ اُن میں سے اکثر فلمی اداکاروں کی تصاویر ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔

ہاسٹل کی دو نہایت اہم شخصیت یعنی (RT) اور منشی صاحب کا تذکرہ دانستاً نہیں کیا جارہا حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہاسٹل کا مضمون ان کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ مگر چونکہ ہم مزاحیہ مضمون کا انجام، المیہ انداز میں نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے ان کے بارے میں پھر سہی۔ آخر میں ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ہاسٹل کی خامیاں اپنی جگہ لیکن اس زندگی کا اپنا ہی مزا ہے اگر آپ کو موقع ملے تو ہاسٹل میں پڑھ کر میرا مطلب ہے کہ ہاسٹل میں پڑ کر ضرور دیکھئے گا۔

سنہری باتیں

۸۴۔ خدا اس ''اونھ'' سے بچائے جس کی زبان پر آیا اس کو تباہ کیا۔ جس ملک میں پھیلا اُس میں گدھے کے ہل چلوا دیے۔

۸۵۔ مرنے والے سے یہ سرٹیفکیٹ مانگا جاسکتا ہے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ میں واقعی مر چکا ہوں۔

۸۶۔ کچھ لوگ پیکٹ سے سگریٹ ایسی نزاکت اور نفاست سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں واقعی نکل نہ آئے۔ (فردوس عالم)۔

۸۷۔ مونگ پھلی پیدا کرنے والے بڑے آدمی بھی بن سکتے ہیں۔ مثلاً صدر وغیرہ۔

۸۸۔ جب اسکولوں کے عملے کے لوگ ہڑتال سے فارغ ہو کر واپس ہوتے ہیں تو استاد اسٹرائیک پر چلے جاتے ہیں۔

۸۹۔ کچھ لوگ اخبار میں اپنا نام اور تصویر شائع کرانے کے لئے کسی چھوٹے موٹے حادثے کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔

۹۰۔ ہم کسی فوٹو گرافر کو کسی میت کی تصویر اتارتے دیکھتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ کہیں مرحوم بہتر پوز دینے کے لئے اُٹھ کر نہ بیٹھ جائے۔ (عطاء الحق قاسمی)

۹۱۔ ایک صاحب نے ایک صحافی دوست سے پوری سنجیدگی سے کہا: ''میں پاگل ہو گیا ہوں ذرا خبر لگا دینا''

۹۲۔ انسانی نیت کا کیا اعتبار، جانے کب ڈانواڈول ہو جائے۔

۹۳۔ مونچھیں ہمارے معاشرے میں مردانگی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔

”ناک“

محسن رضا
12-ME-76

ناک کا مسئلہ بڑا گھمبیر ہے۔آج تک بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آسکا۔اس کی اہمیت صدیوں سے مسلم ہے اور اس رونا ابتدائے آفرینش سے رویا جاتا رہا ہے۔

دنیا میں آج تک جتنے فسادات ہوئے ہیں ان میں ناک پیش پیش رہی ہے۔لیکن جتنی حساس پاکستانیوں کی ناک ہے اتنی تو کسی قوم کی نہیں رہی ہوگی۔مسئلہ چاہے کوئی بھی ہو بات ناک پر آہی جاتی ہے۔ہمارے ہاں لوگ ساری عمر اسے بلند کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔پھر بھی یہ اتنی ہی رہتی ہے۔اکثر لوگ یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں کہ فلاں کی ناک کٹ گئی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمیں آج تک کسی کی ناک کٹی ہوئی نظر نہیں آئی۔

اللہ معاف کرے! ہمارے ایک سر ہوتے تھے۔انہوں نے ناک پر اسائنمنٹ لکھنے کو دی۔باوجود تلقین کے جب اسٹوڈنٹس نے مسلسل سستی دکھائی تو سر نے اسے ناک کا مسئلہ بنالیا۔بھئی یا تو اسائنمنٹ لکھیں یا کلاس سے ناک آؤٹ اور ناک کٹوا کے بھی ناک آؤٹ۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

ابھی حال ہی میں ہماری ایک کلاس میں بھی ناک کا ایک شہرہ آفاق مسئلہ چل نکلا۔سر کہتے تھے۔یہ ناول تم خود پڑھو گے۔طالب علم بیچارے معذرت خواہ تھے کہ ہم سے نہیں پڑھا جاتا۔اُدھر بہت سی ناکیں، معاملہ تو گھمبیر ہونا ہی تھا۔بس جناب سر کلاس میں اور ناک پسند اسٹوڈنٹس باہر ٹال مٹول کر رہے ہوتے۔بہر حال ناکوں کی کشمکش زوروں پر ہے۔نتیجہ چند دنوں میں آنے کا امکان غالب ہے۔میں کہتا ہوں سب نے اس غریب کو ہی مشق ستم کیوں بنایا ہوا ہے؟ کبھی ناکوں سے چنے چبوائے جاتے ہیں کبھی ناک رگڑوانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔کبھی معاملہ ناک کٹنے تک بھی پہنچ جاتا ہے اور اگر نوبت مار کٹائی تک پہنچ جائے تو گھونسے بھی ناک پر ہی پڑتے ہیں اور کیا ناک کے اطراف لگی آنکھیں اور کان اس کے زیریں جانب کڑکڑ چلتی زبان کسی کو نظر نہیں آتی۔جو ہر معاملے میں اس غریب کو گھسیٹ لیا جاتا ہے۔اور پنجابیوں کی ناک کے کیا کہنے وہ تو اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتے۔جن کی ناک حساس ہی کیا خطرناک بھی ہوتی ہے کہ گردن کٹ جائے ناک نہ کٹے۔خیر حوصلہ افزاء بات یہ ہے کہ دورِ حاضر میں ایک ناک فراموش طبقہ بھی سامنے آرہا ہے۔جو ناک کو سرے سے اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں۔ ان کا دانشورانہ مقولہ یہ ہے کہ ناک نے کدھر جانا ہے۔یہ چہرے پر ہی رہتی ہے۔سبحان اللہ! کیا فہم و فراست ہے۔لیکن صد ہائے افسوس ایسی معقول سوچ کا اس ناعاقبت اندیش قوم میں کوئی قدردان ہی نہیں۔الٹا انہیں ڈھیٹ اور بے غیرت جیسے دل شکن خطابات سے نوازا جاتا ہے۔

ناک چاہے چھوٹوں کی ہو یا بڑوں کی، یکساں طور پر اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔بڑے اگر ناک بلند کرنا چاہیں تو چھوٹے بھی اسے جھکانا نہیں چاہتے اور اکثر و بیشتر معاملہ ایسی حساس نوعیت اختیار کر جاتا ہے کہ لوگ اس آدھی چھٹانک سے بھی کم ناک پر اپنے چین و سکون اور یہاں تک کے پوری زندگی کی خوشیاں بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور پھر باقی عمر اسی ناک کو بیٹھے روتے نظر آتے ہیں۔اب یہی

دیکھئے فرسٹ ائیر کے شروع شروع کے دنوں میں ہم آتے جاتے بڑے زور وشور سے اپنے سینئرز کو سلام جھاڑتے لیکن ان سینئرز نے کبھی معقول طریقے سے آگے بڑھ کر سلام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ پھر سمجھ آیا کہ یہ مسئلہ ناک کا ہے۔ آگے بڑھ کر سلام کرنے سے یقیناً ان کی ناک کٹ جاتی ہوگی۔ یہ بات سمجھ آتے ہی ہمیں ایک اکلوتی ناک کا خیال آ گیا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ سلام کی نوبت کبھی کبھار ہی آتی ہے۔ ہم ناک کی سیدھ میں ادھر چلے جاتے ہیں اور سینئرز ناک سنبھالے ادھر۔ بس بھئی، پنجابیوں کی ناک سے ناکیں رگڑا ہی نہ کھا جائے۔ قول شاعر۔

گر وہ ناک دار ہیں تو بے ناک ہم بھی نہیں

آخر میں یہ حقیر سی تجویز گوش گزار کروں گا کہ معاشرے میں ناک پسندی کے بڑھتے ہوئے مرض کی روک تھام کے لئے حکومتی سطح پر اقدامات ہونے چاہئیں۔ اور ناک فراموشی کے ضمن میں ایسی کمیٹیاں قائم کی جانی چاہئیں۔ جو منصوبہ بندی ناک کے تحت عوام الناس کو اس مہلک مرض سے نجات دلا سکیں اور ہماری زندگیاں ناک کے اثرات سے محفوظ ہو سکیں۔

سنہری باتیں

۹۴۔ جہاں تک میرے نام کا تعلق ہے اس بارے میں میں خود بھی یقین کی کیفیت سے دوچار ہوں۔ کیونکہ کاغذات میں، گھر میں اور گھر سے باہر میرے مختلف نام ہیں۔

۹۵۔ س: اہرام مصر کہاں واقع ہیں؟ (جاپان میں، فرانس میں، مصر میں)

۹۶۔ س: سورج دن کو نکلتا ہے یا رات کو؟ سوچ کر بتائیں۔

۹۷۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ افغانستان کی سب سے مشہور بندرگاہ کونسی ہے؟

۹۸۔ س: ایک درجن میں کتنے عدد ہوتے ہیں؟ (۷۸۶،۱۲،۵)

۹۹۔ س: مقبرہ جہانگیر میں کون سا مغل بادشاہ دفن ہے؟ (سکندر اعظم، ہنری ہشتم، جہانگیر)

۱۰۰۔ مجھ سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے، روٹی رات کی

امتحان اور طالب علم

رضوان علی حیدر
12-CP-82

طالب علم کی لغت میں سب سے خوفناک لفظ امتحان ہے۔جس کے خیال سے ہی انہیں ہول اُٹھنے لگتے ہیں۔ہم خود بھی کئی امتحان سے بارہا گزرے ہیں۔

یہ خیر سے ان دنوں کی بات ہے جب ہم میٹرک میں ہوا کرتے تھے۔مرلی دھرن کی مسکراہٹوں، شاہد آفریدی کے چھکوں اور شہزاد رائے کے گانوں کے درمیان زندگی اچھی بھی گزر رہی تھی۔ ہر روز عید اور ہر رات شب برات کی مانند گزر رہی تھی اور ہم خوب ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ دن بھر سکول میں اچھلتے کودتے تھے۔شام کو کرکٹ کے میدانوں میں اپنا چھپا ہوا جوہر باہر نکالتے تھے۔مگر بورڈ والوں کو ہماری آزاد منش ادا کچھ پسند نہ آئی۔اور انہوں نے رنگ میں بھنگ ڈالنا اپنا فرض عین سمجھا۔

گورنمنٹ سکول جانے کی حد تک تو ہم اس معقولے پر عمل پیرا تھے۔

''قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا''

ایک دن محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے دل پر پتھر رکھ کر سکول گئے تو ہمارے ایک کلاس فیلو نے یہ خبر سنا دی کہ ڈیٹ شیٹ آ گئی ہے۔ یہ خبر سن کر ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔اور اچانک زندگی رک سی گئی اور ہمیں بے اختیار یہ مصرع یاد آ گیا۔

کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں

جلدی نے ڈیٹ شیٹ بھی اچھے طریقے سے دیکھنے نہ دی کہ دو دن بعد ہمارا پرچہ ہے۔گھر آ کر ہم نے پڑھائی کرنے کے بارے میں سوچا' گھر کے کونوں کھدروں میں موجود کتابیں نکالیں اور ان پر صدیوں سے جمی گرد جھاڑی۔جلدی سے حسنات حیدر کے گھر گئے اور اس سے نوٹس کا مطالبہ کیا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔نمک حرام کنٹین کی پی ہوئی بوتلیں بھی بھول گیا۔جو ہم نے اماں کی نظر سے بچا کر اُٹھائے ہوئے پیسوں سے پلائی تھیں۔ہم نے اسے خوب صلواتیں سنائیں اور بدلہ کسی اور موقع پر لینے کا سوچا اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی مدد آپ کا ارادہ کیا کہ ''خدا ان کی مدد کرتا ہے۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔'' کیوں کہ پاس بھی ہونا تھا۔ہم نے اپنا خصوصی ٹائم ٹیبل بنایا تا کہ وقت کی پابندی کامیابی کی ضامن بن سکے۔ٹائم ٹیبل کچھ ایسا بنا جس میں ٹی وی، فلموں اور کرکٹ کے میچوں کو دیکھنے کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ تا کہ ہمارے ذہن پہ پڑھائی کا ناروا بوجھ نہ پڑے۔وہ علیحدہ بات ہے کہ ٹائم ٹیبل بچارہ عمل ہی مانگتا رہ گیا۔

رات کو گھر والوں نے کمرے میں بند کر دیا تا کہ ہم بغیر کسی مداخلت کے پڑھائی کر سکیں۔اور ہر چیز بغیر کسی محنت کے ہمارے پاس پہنچنے لگی۔ہم ایک آنکھ سے پڑھتے جا رہے تھے اور دوسری آنکھ کو سہلا رہے تھے تا کہ کچھ یاد کیا جا سکے۔آخر کار چار گھنٹے کی مسلسل کاوش سے ہم دو سوال یاد کرنے اور ایک سوال اپنی آستین پر لکھنے میں کامیاب ہو گئے۔بہر حال چند گھنٹے کی پڑھائی کے بعد ہم وہیں میز پر ہی سر رکھ کر سو گئے۔

آخر ہم صبح اُٹھے اور سکول جانے کے لئے پر تولنے لگے' مگر ہماری پرچے کی تیاری مکمل تھی یعنی میز پر موجود نئے کپڑے جوتے اور پن ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ڈیڑھ گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد تیار

ہوگئے۔ گھر سے سکول روانہ ہوتے وقت ابا نے گلے لگا کر، اماں نے دعائیں دے کر اور آپی نے آیت الکرسی پھونک کر اس ادا سے رخصت کیا کہ ہمارا دل بھر آیا اور ہم اماں کے گلے لگ کر خوب روئے ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمارا جوتا جواب دے گیا۔ جو کہ ابھی کل ہی اماں کے ساتھ جا کر بازار سے خریدا تھا۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہم نے قریب سے ہی ایک بوسیدہ کپڑا تلاش کرلیا۔ اور اس سے اپنے جوتے کو خوب مضبوطی سے باندھا۔ خراماں خراماں سکول کی طرف بڑھنے لگے۔

کمرہ امتحان کی طرف گئے اور اپنا رول نمبر ڈھونڈنے لگے۔ بالا آخر ڈھونڈنے والا پا ہی لیتا ہے۔ یکا یک بلڈنگ میں بھونچال سا آنے لگا' ہر چیز ادھر سے اُدھر ہوگئی۔ کوے اور چڑیاں اُڑ کر کائیں کائیں اور چوں چوں کرنے لگے اور لڑکے ادھر اُدھر جانے لگے۔ ہمیں پتہ چلا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ پرچہ ملنے کا انتظار کرنے لگے' مگر دیکھتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ حساب لگا کر دیکھا تو ان میں سے ہمیں صرف ڈیڑھ سوال آتا تھا۔ خدا خدا کر کے اس کو حل کیا۔ دوسرے سوال کیلئے ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔ اس سوال کے لئے ہم ''بے دیکھنے کی چیز اُسے بار بار دیکھ'' کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے سامنے والے لڑکے کے پرچے پر نظریں جما کر دیکھنے لگے مگر جلد ہی اس نے ہمارے غلط ارادوں کو بھانپ لیا اور ہم سے پرچہ چھپا لیا۔ خیر کوئی بات نہیں اس سے جلد ہی بدلہ لیں گے بے عزتی کا۔ سو ہم نے خود پرچہ حل کرنے کی ٹھانی کیونکہ ہم نے سن رکھا تھا ''اپنا پرچہ آپ حل کرا گر زندوں میں ہے'' اور ہم خود کو مردوں میں تو ہرگز نہ سمجھتے تھے۔ لیکن ''ہمت مرداں مدد خدا'' کے تحت ہم پر غیب سے خدا کی مدد نازل ہوئی یعنی پیچھے سے ایک عدد بُوٹی وصول ہوئی جسکی مدد سے ہم سوال حل کرنے لگے۔ مگر عین اس وقت جب ہم یہ سوال حل کر رہے تھے کمرے میں موجود نگران ہماری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ ہمارا خون خشک ہوگیا اور ہم ادھر ادھر بغلیں جھانکنیں لگے۔ آخر تین سوال حل کرنے کے بعد یوں کمرہ امتحان نظر آیا جیسے

''بڑے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے''

دو متواتر پرچوں کے بعد دو چھٹیاں تھیں اور ہم نے اس دوران خوب فلمیں دیکھنے کا پروگرام بنایا تاکہ ہمارے تھکے ہوئے اعصاب سکون پا سکیں۔ انگریزی کی ضرب المثل یاد تھی۔ (Rest is the best for test)۔ مگر یہ ظالم دنیا کب کسی کی خوشی برداشت کرسکتی ہے۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ نشیمن جلا دیتی ہے۔ ہمیں صبح ہی پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ اور رات کو پاکستان کا میچ تھا اور ہم دل کو بہلانے کے لئے یہ گا رہے تھے۔

آتا ہے یاد مجھ کو وہ گزرا ہوا زمانہ
وہ سٹیڈیم کی بہاریں، آفریدی کا چھکا لگانا

لیکن اس ظالم امتحان نے ہماری فنکارانہ صلاحیتیں جو تھیں ان کا دیوالیہ نکال دیا۔ چند مہینوں کے بعد رزلٹ آگیا جس میں ہم تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتے ہوتے رہ گئے۔

''قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ٹوٹی کہاں کمند''؟

بہرحال اس سے ہماری شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ

''گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں''

کنفشن پیجز

نفیسہ بی بی
13-SE-02

UET میں کنفشن پیجز سے کون واقف نہیں اور اگر کوئی واقف نہیں تو وہ (Real Uetian) کی روح سے نابلد ہے۔ UET کو ایک گلوبل ویلج بنانے میں یہ پیجز بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے UET میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و سانحہ ہائے عشقیات پر نظر رکھنا چاہتے ہوں، ہر نئے (Crush) سے باخبر رہنا چاہتے ہوں یا پھر طلبہ کے ٹوٹتے بنتے تعلقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں اور لوگوں کے ان کہے جذبات سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں تو بلا مبالغہ یہ کنفشن پیجز آپکی امیدوں پر پورا اُتریں گے۔

یونیورسٹی میں ان پیجز کی اہمیت نیوز چینل کی سی ہے۔ یہ پاکستانی نیوز کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر آدھے پونے گھنٹے بعد کوئی نہ کوئی نیوز بریک کرتے رہتے ہیں۔ پھر چاہے کھوپڑی بریک ہو یا ہارٹ بریک، انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ UET میں یہ پیجز اتنی مقبولیت حاصل کر گئے ہیں کہ شاید کچھ عرصے بعد UET کے سارے Official Pages بھی نام بدل کر UET Official Confessions وغیرہ کی طرح کے نام رکھ لیں گے کہ شاید کوئی انہیں بھی لائک کرے ورنہ اس بات کا ڈر ہے کہ شاید اختتام سمسٹر، شروعات سمسٹر، سالانہ طعام، فیس، سالانہ امتحانات کی اطلاعات بھی نوٹس بورڈ پر آویزاں کرنے کی بجائے کسی Cofession Page پر چڑھائی جائیں گی اور سٹوڈنٹس کنفس (Confess) کرنے والے متعلقہ حکام کو ''Tag'' کر کے فخر محسوس کیا کریں گے۔

انجینئرنگ یونیورسٹی ہونے کے ناطے UET میں ہر کام کے لئے یہاں طلبہ نے خود ساختہ فارمولے وضع کئے ہوئے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے سنا تھا کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں لیکن UET میں ایک اور ایک ٹرپل انٹیر گرل لے کر ایسے فارمولے سے جمع کرتے ہیں کہ وہ گیارہ کی جگہ ایک سو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ UET کے طلبہ کی ایک خصلت، شہرت حاصل کرنا ہے۔ UET میں مشہور ہونے کے فارمولا زمین یوں تو فالتو اوقات میں اپنے ڈیپارٹمنٹ سے زیادہ دوسرے ڈیپارٹمنٹس میں رہنے کو ترجیح دینا ہے، Centaraus میں تصاویر بنا کر Upload کرنا شامل ہیں۔ مگر آپ کمی وقت کی وجہ سے راتوں رات بام وعروج پر متمکن ہونا چاہتے ہیں تو لازماً آپ کو پھر سب سے سستے اور آسان فارمولے کنفشن پیجز سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر کے جب زیادہ سے زیادہ لوگ Online ہوں تو ایک اوٹ پٹانگ قسم کی کنفشن Post کر دیں۔ چاہے وہ کہیں سے Copy ہی کی گئی ہو پھر دیکھیں اس ''ویلی'' عوام میں آپکو کتنے غالب و فراز نظر آتے ہیں۔ اگر آپ کی Confession پر ایک بھی Comment ہو جائے تو سمجھ جائیں کہ آپ نے اپنا نصب العین پا لیا ہے۔ اب آپکو مشہور و معروف ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پھر Confession کا ایک لامتناہی سلسلہ مناسب Intervals کے بعد شروع کر دیں یہاں تک کے کوئی ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے نہ پڑھ جائے۔

پھر بس آپ کی شہرت کے چرچے ہر ڈیپارٹمنٹ میں ہوں گے۔ اگر شہرت اچھی نہ ہو تو غم نہ کیجئے کیونکہ

''بدنام ہوئے تو کیا نام نہ ہوگا''

اگر آپکو Confession کے لئے کوئی موضوع نہیں مل رہا تو اپنے اردگرد دیکھئے جو چیز سب سے پہلے نظر آئے اس کے بارے میں Confess کردیں پھر چاہے۔ وہ آپکی جلی ہوئی رضائی، یا امرودوں کی پلیٹ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں نا

"Every Thing is fair in love and war" کنفشن پیجز کے لئے ہم نے یہ معقولہ تھوڑا بدل دیا ہے۔

"My Confession is fair in confession page" رازداری کی شرط رکھتے ہوئے یہ پیجز آپ کو

''بول کے لب آزاد ہیں تیرے''

کے مصداق اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر پھر بھی آپکو اس میں کوئی مشکل پیش آرہی ہے تو ہم آپکو Confession کے تازہ ترین موضوعات بتا دیتے ہیں اور وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

انکو انگلیوں کے پوروں (Finger Tips) پہ یاد کرلیں اور روزانہ جاپ کیا کریں تاکہ کامیاب Confessionist بن کر UET کی خدمت کرسکیں۔

(i) Cold Drink کی بوتل

(ii) ٹنڈ

(iii) UET کی بس

(iv) لائبریری کی دوسری منزل

(v) سافٹ ویئر کی تتلیاں

(vi) Telecom کے Initials

(vii) رشتہ Online وغیرہ وغیرہ

ان میں سے کسی کے بارے میں Confess کرکے آپ چند گھنٹوں مین ہٹ ہوسکتے ہیں (مگر دھیان رہے، پٹ بھی سکتے ہیں) اور کوئی بھی Confession کرنے کے بعد اسے خود لائک کرنا اور اپنے ہی دوستوں کو Tag کرنا نہ بھولیے گا تاکہ دوسرے آپکا Confession ذرا غور سے پڑھیں۔ ہم ثابت کرکے دے سکتے ہیں کہ ایک کامیاب UETIAN فیس بک کے بغیر نہیں بن سکتا اور یہاں کی فیس بک کی جان Confession Pages ہیں۔ اس لئے کامیاب انجینئر بننے کے لئے فوراً ایک عدد Confession Page بنا لیجئے۔ ورنہ کوئی اور تو بنا ہی لے گا اور ایک دن میں اس سے 26 سے 28 گھنٹے تو ضرور دیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپکو Face Book کی پروگرامنگ (Programming) سمجھ آجائے اور آپ اس سے بھی بڑی ویب سائٹ بنالیں۔ ویسے بھی GPA میں کیا رکھا ہے۔

تکنیکی صلاحیتیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ہمارا GPA ویسے بھی ڈالر کی طرح دن بدن گرتا جارہا ہے۔ تکنیکی صلاحیتیں بھی نہ ہوئیں تو شاید ایک دن ہمیں آلو چھولے کی ریڑھی لگانی پڑے اور ساتھ ساتھ

''50 روپے پلیٹ، 50 روپے پلیٹ کے نعرے بھی!!!''

"سروے"

ذیشان خالق چودھری
11-CE-189

۱۔ ماں کی دعا جنت کی ہوا ساس کی دعا؟؟؟

(i) بیٹا پیسہ لا۔۔۔۔۔۔۔ (13 SE 24)
(مانگ کر؟؟؟؟)

(ii) Experience ہوگا تو بتاؤں گی۔ (12-EE-75)
(بڑی شدید خواہش لگتی ہے)؟؟؟

(iii) زندگی پرسکون۔۔۔۔۔۔ (10-EE-41)
(جیسے یونس فین؟؟؟)

(iv) بہت بُری۔۔۔۔۔۔۔۔ (13-SE-10)
(خدا تجھے کیسی ساس سے آشنا کردے)

(v) وہ بھی جنت کی ہوا۔۔۔۔ (13-CP-23)
(یہ بہو بننے کے بعد کہہ کر دکھانا)

(vi) جا بیٹا دوزخ جا۔۔۔۔۔ (12-ME-166)
(کر یہ پکڑ لو یار دوزخ جانے کا۔۔۔۔)

(vii) دعا ہمیشہ جنت کی ہی ہوتی ہے۔ (12-CE-124)
(گل نے سیانی اے تیری۔۔۔۔۔)

(viii) ہے تو وہ بھی ہوا ہی۔۔۔۔۔۔ (13-ME-102)
(ہوا سے یاد آیا یار پنکھا چلانا۔۔۔۔)

(ix) ابھی Experience نہیں کیا۔۔۔ (12-SE-54)
(کرنا بھی نہ یہ کونسا World Cup ہے)

(x) ٹرک کا دھواں۔۔۔ (11-CP-145)
(چھوٹے!! ٹائروں میں بھی ہوا چیک کرلو)

(xi) جا بیٹی روٹیاں پکا۔۔۔۔ (10-ENV-92)
(کام کی ناکاج کی دشمن اناج کی)

(xii) میرا داماد رن مرید ہو (12-ME-118)
(جب آپ کا ہوگا تو دیکھیں گے)

(xiii) (No Idea)۔۔۔۔۔(10-SE-42)
(Get Idea sim from India)

(xiv) ابھی ملی نہیں ساس (10-IE-85)
(آپکی یہ حسرت بھی عنقریب پوری ہوجائے گی)

۲۔ شیشہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟؟

(i) اُف خدایا! کیا سوچ کے مجھے اتنا حسین بنایا (10-ENC-76)
(پھر یقیناً آنکھ کھل گئی ہوگی؟؟)

(ii) کچھ بھی نہیں (10-EE-108)
(شیشے میں بھی کچھ نظر نہیں آتا ہوگا پھر)

(iii) ماشاءاللہ (11-SE-27)
(کہ انسانوں میں ایسی مخلوق ہوتی ہے؟؟؟)

(iv) دنیا کے سب سے حسین نوجوان کا (13-SE-53)
(کہ وہ کہاں ہوگا؟؟؟)

(v) کہ ابھی بھی دنیا میں حسین لوگ باقی ہیں (13-SE-02)
(مگر وہ شیشے میں نہیں آتے)

(vi) کہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے (11-CP-111)
(مثال کے طور پر۔۔۔۔۔۔۔؟)

(vii) کہ ہزار لوگوں سے حسین بنایا (12-EE-92)
(مگر دنیا میں تو عربوں لوگ ہیں)

(viii) ایک اچھا خیال آتا ہے (11-SE-76)
(کہ خد کو گولی مارلوں۔؟؟؟)

(ix) کہ میں کتنی حسین ہوں (13-CP-09)
(آپ یہ بات کسی اور سے نہ کہہ دینا اب)

(x) زندگی کی خوبصورتی کا۔۔۔ (13-CE-59)
(جو آپ میں تو بالکل نہیں ہے؟؟؟)

(xi) (Am I Dressed Properly) (10-IE-33)
(جی نہیں۔۔۔؟؟)

(xii) سب سے خوبصورت ہوں (11-SE-197)
(چل جھوٹا۔۔۔۔۔)

(xiii) کاش۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (13-SE-98)
(میں بھی حسین ہوتا)

(xiv) شاہ رخ خان ہوں میں (13-IE-20)
(R.I.P ستا شاہ رخ)

۳۔ اگر آپ کو سلیمانی ٹوپی ملے تو یونیورسٹی میں کیا کاروائی کریں گے؟؟

(i) ماحول بہتر کروں گی (11-SE-84)
(ماحول کی آلودگی اب ختم نہیں ہوسکتی)

(ii) رزلٹ تبدیل کر کے 4 GPA کر دوں گی (13-TE-21)
(وہ تو ویسے بھی ہو سکتا ہے)

(iii) قتل عام (12-CP)
(دھیان سے اپنے ہی چھری نہ مار لینا)

(iv) پیپرز دیئے بغیر سب کو پاس کرا دوں (10-SE-44)
(بس اسی لئے آپ کو نہیں دے رہے)

(v) چپکے چپکے سے ہیلپ (12-ENV)
(اچھا مدر ٹریسا)

(vi) GF کے ساتھ UET کا ہوائی دورہ (12-ME-88)
(ہوائی چیزیں اور ہوائی شوق)

(vii) یونیورسٹی میں رکتا کون پھر (13-SE-95)
(آپ کو یہاں رہنے کون دیتا ہے؟)

(viii) لڑکیوں لڑکوں کی Saparate بس (13-SE-97)
(بس کا ٹوپی سے کیا تعلق)

(ix) لڑکوں کی غائب (11-CP)
(کہاں۔۔۔؟؟)

(x) ٹیچرز کے سارے آفس لاک کر دوں گی (13-SE-02)
(اندر سے یا باہر سے۔۔۔؟؟؟)

(xi) انڈسٹریل ڈیپارٹمنٹ کی عمارت بناؤں گا (13-IE-20)
(ٹوپی کے بغیر بھی عمارت بن سکتی ہے)

(xii) یونیورسٹی بند کروا دوں گا (13-CE-103)
(مشکل سے ہی گارڈ لگتے ہو)

(xiii) لڑکوں سے بدلہ لیں گی (10-IE-33)
(کس چیز کا؟؟؟)

(xiv) دھماکہ (10-CE)
(وہ تو ویسے بھی آپ کرتے ہیں)

۴۔ اگر آپ کو ایک دن کے لئے VC بنا دیا جائے؟؟؟

(i) پہلے بناؤ پھر بتاؤں گا (13-SE-53)
(بس اسی لئے نہیں بنایا)

(ii) Rout Timing تبدیل کر دوں گا (10-SE)
(بھائی آپ لگتے ہی کنڈکٹر ہو)

(iii) لڑکوں کے حقوق سلب (10-IE-85)
(BTW سب سے پہلے کونسا حق؟؟؟)

(دوائی روز لیا کریں۔اب بھی بہتر ہو سکتے ہیں)

(vii) کتنا اچھا ہوتا (13-ME-13)
(آپ کہیں اور ہوتیں تو بھی یہی کہنا تھا)

(viii) پاپڑ بیلتے (13-SE-32)
(ابھی بھی تو وہی کر رہے ہو)

(ix) UET کے لئے خواہش کر رہے ہوتے (13-SE-56)
(گل تے سیانی کیتی اے۔۔۔)

(x) خدا جہاں رکھے وہیں خوش ہیں (12-IE-29)
(اچھا۔۔۔؟؟)

(xi) سکون میں ہوتے (13-SE-95)
(سکون کون ہے۔۔؟؟؟)

(xii) کیا پتہ کہاں ہوتے! (10-ENC-60)
(بڑا برا ہوا پھر تو۔۔۔)

(xiii) کسی اچھی جگہ ہوتے (10-SE-44)
(بندر کیا جانے ادرک کا سواد!)

(xiv) Doing Bacherlors Somewhere (12-EE-92)
(یہاں کون سا Phd کر رہی ہو؟؟؟)

۶۔ سب کہہ دو۔۔۔۔۔۔

(i) Warid (13-ENC-01)
(Phone ابھی تک آپ کا Ptcl پہ ہی آتا ہے)

(ii) لڑکیوں کے بغیر زندگی بے کار ہے (13-SE-74)
(چل جھوٹا!)

(iii) University کا Crowd بہت Cheap ہے (11-CP-171)
(بھیجتے ہیں آپ کو پریس میں)

(iv) زندگی! (12-SE-61)
(Chuss)

(v) کیوں تیرا وایہ ہے؟ (- - 41)
(بتاتے ہوئے شرم آتی ہے)

(vi) کہہ تو دوں پر ابھی دو سال یونیورسٹی میں بھی رہنا ہے (12-ME-118)
(چل کوئی نئی!)

(vii) تھوڑے Strict Rules کم کر دو (13-ME-79)
(100 کا لوڈ کرواؤ پہلے)

(viii) سب کہا بھی نہیں جا سکتا، کچھ باتیں چھپانے کی ہوتی ہیں (10-ENV-92)
(ایسی باتیں پوچھی بھی نہیں)

(ix) I Love Pakistan! (13-SE-86)
(وڈاکپ دیئوانیوں!)

(x) اتنا Time نہیں ہے (13-CE-175)
(اچھا جی!)

(xi) عائشہ ہال کو بھی ساتھ لگاؤ (13-SE-98)
(بھائی کو کتنا خیال ہے)

(xii) That is none of your Business (13-CP-09)
(یہ کونسا Business ہے؟؟)

(xiii) ہاں ہاں میں تم سے پیار کرتی ہوں ( )
(Me too)

(xiv) ترقی کا مطلب moderniom ہے۔ادھر کے لوگوں کے مطابق، (11-SE-189)

۷۔ اگر یونیورسٹی لڑکیوں سے خالی ہوتی؟؟؟

(i) تو پھر ہمارا کیا ہوتا؟ (13-CP-77)
(تم بھی تو لڑکی ہو!)

(ii) پھر کس نے آنا تھا لڑکوں میں سے وہ بھی اتنی دور! ( )
(تیری سوچ ہے کاکی!)

(iii) تو پٹھانوں کی بستی ہوتی (12-SE-54)
(اور آپ ان میں پھنسے ہوتے)

(iv) تو بہتر ہوتا (13-ME-58)
(یونیورسٹی کا نظام)

(v) تو رونق نہ ہوتی (13-ME-52)
(لڑکیوں کی زندگی میں۔۔۔ہے ناں!)

(vi) اچھا ہوتا (12-SE-98)
(اچھا ہوتا اگر تو بھی نہ ہوتا)

(vii) وجود زن سے ہے یونیورسٹی میں رنگ (10-IE-85)
(کالا، نیلا، پیلا رنگ!)

(viii) بے رونق ہوتی (10-ENC-76)
(آپ کی طرح؟؟!!)

(ix) یونیورسٹی ایک اجڑا گلستان ہوتا (10-SE-60)
(یعنی ''قبرستان''!)

(x) تو میں لڑکا ہوتی! (13-ME-01)
(Chussss!)

(xi) لڑکے ہی نہ ہوتے تو۔۔۔ (13-SE-10)
(دل خوش کر دیا)

(xii) تو مزہ نہ آتا (12-EE-75)
(مزہ لیتے لیتے۔۔۔۔پتہ ہی ہوگا کی نہ!)

(xiii) توبہ! (11-CP-171)
(پکی بات ہے لڑکی ہی ہو؟؟)

(xiv) تو صحرا ہوتا (10-EE-152)
(سچی کہی!)

۸۔ اگر محبت بازار میں بکتی تو خریدار ہوتے؟؟؟

(i) مجھے بازاری چیزیں پسند نہیں (13-IE-20)
(بازاری لوگ)

(ii) ضرور لیکن ایک شرط پر کہ مفت ملنی چاہیے (13-SE-53)
(کسی دربار چلے جانا، جمعرات کو!)

(iii) جی بالکل! (11-SE-27)
(انڈوں کی نہیں محبت کی بات ہو رہی ہے)

(iv) نہیں جی! آپ ہی خریدیں (10-SE-44)
(Are you Interested in Selling?)

(v) یقیناً (12-CP-32)
(بھائی لنڈے کی بات نہیں ہو رہی)

(vi) ہاہاہا! (13-SE-95)
(لالالا۔۔۔!)

(vii) نہیں۔۔!میرے پاس Allready بہت محبتیں ہیں (13-ME-172)
(کتنے Boy Friend ہیں؟)

(viii) Never ( )
(کل ہی تو I Love You بولا تم نے۔۔۔!)

(ix) نہیں!! (13-SE-56)
(آپ کو دوسری بار روٹی نہیں ملتی، محبت کس نے دینی ہے؟)

(x) Not at all! (10-SE-44)
(تھوڑی سی ہی لے لو۔۔)

(xi) میں بھی خریدار ہوں، میں بھی خریدوں گا، پیار کہاں بکتا ہے، پتہ بتا دو۔ (11-CE-128)
(میرے سٹور پہ)

(xii) اگر سستی ہوئی تو خرید ہی لیتے ہیں (11-ENV-94)
(اس میں بھی کنجوسی، کیا بنے گا آپ کا؟؟)

(xiii) نہیں! محبت ایک بیماری ہے (13-SE-32)

(جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہے)

(xiv) نہیں بیچنے والے ہوتے (13-CE-151)

(دس کا محبت 20 روپے میں!!)

۹۔ ﴿اگر کسی لڑکی کا گم شدہ پرس مل جائے؟؟؟﴾

(i) واپس کردوں گا (12-CE)

(ایڈا تو حاجی اکشے)

(ii) میں خود لڑکی ہوں (11-SE)

(چور، چور، چور۔۔۔۔)

(iii) پیزا کھا کر واپس کردوں گا (12-SE-54)

(آپ کو Mess میں سپلی کوئی نہیں دیتا اور Pizza؟؟)

(iv) واپس کردوں گی پیسے لے کر (11-ENV)

(کتنے پیسے لے کر؟؟؟)

(v) کسی اور لڑکی کو دوں گا کہ چیک کرے کس کا ہے (12-SE-61)

(فردوس کی لان آپ کی ہوئی)

(vi) پیسے نکلا کر پرس پھینک دیں گے (11-CE)

(سوچ ہی غریبوں والی ہے)

(vii) اس میں اپنا موبائل نمبر ڈال کر واپس (12-ME-166)

(پھر آپ کو شام کو Reply آئے گا Thank You بھائی)

(viii) موبائل نمبر دیکھوں گا (12-CP-52)

(ہاں پرس کے اوپر ضرور لکھا ہوگا)

(ix) چھوڑیار اگر کسی لڑکی نے پڑھ لیا تو؟؟؟ (13-CE-175)

(تو اسے بھائی کی سوچ پتا چل جائے گی)

(x) خالی کر کے واپس رکھ دوں گی (10-E-184)

(انجینئر بن گئی، پر عادتیں نہیں گئیں)

(xi) میں خود لڑکی ہی ہوں (10-ENV-59)

(73ء کے آئین کے مطابق لڑکی کو لڑکی کا پرس نہیں مل سکتا)

(xii) امیر بن جاؤں گی (10-CP)

(کیوں پیسا پیسہ کرتی ہے۔۔۔؟؟)

(xiii) موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا (13-ME-58)

(مار کھانے کا؟؟؟؟)

(xiv) اسکا ID کارڈ دیکھوں گا (12-CP)

(لگتے ہی بیمہ کرنے والے ہو)

۱۰۔ ﴿اگر کسی کو پنچ مارنا پڑ جائے تو کیسے ماریں گے؟؟﴾

(i) No Comment (13-SE-02)

(کیا مدد درکار ہوتی ہے آپ کو؟؟)

(ii) جیسے مارتے ہیں ویسے! (12-EE-75)

(بی بی! سوال پڑھ لو پہلے)

(iii) Malinga (13-SE-10)

(ماں صدقے!!)

(iv) ایک ہو تو بتاؤں (10-ENC-76)

(اتنی آشنائی نہیں رکھنی تھی ناں پہلے!)

(v) ہاتھ سے (13-CP-41)

(دیکھو! دیکھو! Joke مارا)

(vi) آہستہ! (11-SE-197)

(Good!)

(vii) سیاست دانوں کو! (13-CE-103)

(بھائی کسی ایک کو کہا ہے)

(viii) Yamlay کو (13-ENC-01)

(واقعی اس نے اچھا نہیں تھا کیا۔۔۔۔۔۔)

(ix) طارق میر کو (10-ENV-18)

(آپ کے ابا جان کی عمر کے ہیں)

(x) Don't know (10-EE-06)

(خود کو نہیں جانتیں!!)

(xi) Room mate کو (13-CE-35)

(کاش میں آپ کا Room mate ہوتا)

(xii) Nawaz Sharif، لیکن ہاتھ کا کچھ نہیں بچے گا (10-ENV-92)

(چلو! اکھٹے جائیں گے)

(xiii) اُس منحوس کو جس کو ہمیشہ مارتی ہوں (13-TE-21)

(اتنا پیار کرتی ہو۔۔۔۔۔)

(xiv) جیسے مارتے ہیں۔ (13-CP-77)

(کیسے مارتے ہیں؟؟؟)

شعر و سخن

نظم

84 نعت
جھانزیب احمد

85 تنہا رہنا اچھا ہے
سعد طارق جاذب

85 حب الوطنی
حسین بلال

86 اب بربادیٔ جاں کا گلہ کیوں
حذیفہ مسعود

87 باعثِ تنفس
بشارت عباس میثم

88 محبت اک بارش
جنید افضل

88 زندگی
حسن سرفراز

89 مجھے برداشت ہے
سید احمد

غزل

91 اب کے غمِ دوراں ۔۔
حسن سرفراز

91 کوئی تارا سرِ ۔۔۔
سعد طارق جاذب

92 خدا جانے طلب کیسی ۔۔۔
محمد عمر لودھی

92 خدا کو اپنا رب تو کہا ۔۔۔
نفیسہ بی بی

93 جو خود نہیں کرتے ۔۔۔
امّ ھانی

93 پیاسا واپس ۔۔۔
ذیشان خالق چودھری

94 زمانے کے افسردہ حالات ۔۔۔
اعزاز کاشف

94 لمحے ماضی کے جو ۔۔۔
محمد حسین بلال

95 رہو خانۂ دل میں ۔۔۔
بشارت عباس میثم

95 بے یقینی ۔۔۔
ساجد مسعود

96 کچھ منافع نہ محبت ۔۔
شکیل شاکی

نعت

وہ ابرِ کرم وہ خاتم مرسل بنا ہوا
دل جس کی آرزو میں بسمل بنا ہوا

کاکل بدوش ، امی لقب رہنمائے کل
یوسف تھے جس کے راہی وہ منزل بنا ہوا

بے کس کا چارہ گر تو مفلس کا آسرا
دکھی دلوں کا دافع مشکل بنا ہوا

امت کی کشتی کو پار لگانے کے واسطے
آقا وہی ہے جو آج بھی ساحل بنا ہوا

بے دستِ دیا تھا کل تو جہانزیب لیکن آج
تیرے دم سے رونقِ محفل بنا ہوا

جہانزیب احمد
10-EE-157

تنہا رہنا اچھا ہے !!!

دل کی باتیں سب سے چھپا کر، خود سے کہنا اچھا ہے
آنکھیں باتیں کرتی ہوں تو، چپ ہی رہنا اچھا ہے

چھوڑ کے جا کر آنے والے، اب بولیں تو کیا بولیں
لفظ معانی جو کھو بیٹھیں تو کچھ نہ کہنا اچھا ہے

ساتھ تو چلان اچھا ہے پر ساتھ نبھانا مشکل ہے
تنہا چھوڑے جانے سے تو تنہا رہنا اچھا ہے

کون اُٹھائے بوجھ کسی کا؟ سب کا اپنا جیون ہے
اپنے دکھوں اپنے غموں کو خود پر سہنا اچھا ہے

مرنا جب بھی چاہا میں نے، وہ تو خوشی سے چہک اُٹھے
جاذبؔ ایسے مرنے سے تو، زندہ رہنا اچھا ہے !!!

سعد طارق جاذب
11-SE-165

حب الوطنی

آزاد ہے ، آباد ہے ، غنچہ ہے ، سمن ہے
جنت سے کہیں بڑھ کے حسیں میرا وطن ہے

جیسا بھی ہے ، ہے اپنے لئے زینتِ دنیا
چُوں خار کے ہوتے ہوئے پھولوں میں پھبن ہے

بے قدروں کو کیا قدر، ہمیں جاں سے ہے پیارا
سرمایہ جو اپنا یہی آزاد چمن ہے

خاموشی ، بلبل یہ سکوتِ گلِ رنگیں
دیتے ہیں گواہی کہ یہی دارِ امن ہے

صیاد اگر تاک میں بیٹھے ہیں تو کیا غم ؟
اے مرغِ چمن! تیرا دفاع اپنا مشن ہے

اللہ کرے کوئی خراش آئے نہ تجھ پر
اے پاک وطن! تو مرے آبا کی محن ہے

حسین بلال
13-ME-58

اب بربادیٔ جاں کا گلہ کیوں!!!

تم سے کہا تھا میں نے
کہ محبت نہ کرو تم
کہ آسان نہیں ہے
زیست کو عنوانِ وفا دینا
مگر تم چل پڑے!
صبر آزما طویل رستوں پر
کسی باوفا کی تلاش میں
ایک بھی نہ سنی میری
تم سے کہا تھا میں نے
کہ منزل پا نہ سکو گے تم
کہ نشانِ منزل سے ذرا پہلے
حوصلہ چھوڑ دو گے تم
مگر تم بضد تھے!
منزل کی اور بڑھنے پر
تکمیلِ آرزو کرنے پر
میری بات نہ مانی تم نے
کی اپنی من مانی تم نے
اور پھر!
سب کچھ لٹا کے بھی
منزل سے ذرا پہلے
نشانِ منزل کھو دیا تم نے
زیست کو عنوانِ وفا نہ دیا تم نے
اور مجھے اب کہنے آئے ہو!!!
یہ قصۂ غم
یہ داستانِ الم
گلہ کرنے آئے ہو!!
زندگی لٹا کر آرزو نہ پانے کا
خود کو ہار کر اُس کو نہ پانے کا
حل تلاشنے آئے ہو
بربادیٔ جاں کا
خرابیٔ داماں کا!!
تم سے اب پھر یہ کہتا ہوں
کہ ضبط ہے تہذیبِ محبت کی
ضبط ٹوٹ جانے سے
محبت نہیں ملتی
سنگ ہائے راہِ سفر پر
آس ٹوٹ جانے سے
منزل نہیں ملتی!!!

حذیفہ مسعود

باعثِ تنفس

میری غزلوں کا گیتوں کا عنوان تو
میری اردو میں لکھی بولیاں بھی تمھارے لئے
میں نے ماہیے یا دوھڑے جو بھی لکھے
سارے تیرے لئے
میری نظم و نثر
میرے مضمون ہو مکتوب تیرے لئے
میں شاعر، مصنف، محقق، مقرر
جو کچھ بھی ہوں۔۔۔۔
شاعری کا محرک بھی تو
میری تصنیف تیرا احاطہ کرے
میری تحقیق تجھ کو تلاشا کرے
میری تقریر میں تیرا ہو تذکرہ
اور
میرے اندر کے فنکار کی ساری سرگرمیاں بھی ہیں تیرے لئے۔
بانسری کے سروں سے نکلتی دھنوں کیلئے
میری درکار سانسیں بھی
تیری وجہ سے رواں ہیں۔
تو تنفس کا باعث ہے میرے لئے

بشارت عباس میثم
(وی سی آفس، پوای ٹی تیکسلا)

محبت اک بارش

کبھی جو بارش برستی ہے تو مجھ کو یاد آتا ہے
وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا
محبت ایک بارش ہے
سبھی پہ جو برستی ہے
مگر پھر بھی نہیں ہوتی ---
سبھی کے واسطے یکساں
کسی کے واسطے راحت

کسی کے واسطے زحمت ---
میں اکثر سوچتا ہوں اب
وہ مجھ سے ٹھیک کہتا تھا
محبت ایک بارش ہے
سبھی پر جو برستی ہے
جو مجھ پر بھی برستی تھی
مگر میرے لئے بارش ---
کبھی نہ بن سکی راحت

یہ راحت کیوں نہیں بنتی ؟
کبھی میں خود سے پوچھوں تو
یہ دل دیتا دہائی ہے
کبھی کچے مکانوں کو بھی بارش راس آئی ہے؟؟؟

جنید افضل
12-EE-104

زندگی

وہ عرصہ دراز سے گزار رہا ہے زندگی !
اُسے ابھی پتا نہیں کہ کیا بلا ہے زندگی

کسی کی زندگی ہے مثل ایکس ایل آئے فون ففوں
کسی کی مانند ٹرک گھڑ گھڑا ہے زندگی

اک حسنِ 'زن' کی دلکشی سے زندگی میں رنگ ہے
اسی لئے خیال ہے کہ دل ربا ہے زندگی

دیا تھا مصرعِ طرح ہمارے والدین نے
بلا ردیف و قافیہ غزل سرا ہے زندگی

جسے بھی دیکھئے حسنؔ اُسے ہے یہ لگی ہوئی
کہ گویا ایک مرض ہے یا اک وبا ہے زندگی

حسن سرفراز
11-IE-47

مجھے برداشت ہے سب کچھ

مجھے برداشت ہے سب کچھ
وہ تیرا روٹھنا مجھ سے
وہ تیرا مجھ سے یہ کہنا
کبھی نہ اب میں بولوں گی
تجھے آزاد کردوں گی
وہ تیرا پوچھنا مجھ سے کہ
کیا قابل ہوں میں تیرے
وہ تیرا مجھ سے یہ کہنا
نہیں سندر ہوں میں اتنی
کہ مجھ جیسی ہزاروں اور
لاکھوں تجھ کو چاہیں گی
مجھے کیوں چاہتے ہو تم
مجھے کیوں مانگے ہو تم
کہ میں ایک عام سی لڑکی
تمہارا ساتھ کیا دوں گی
خدارا مجھ کو چھوڑ دو تم
مگر
میں جانتا ہوں جاں !
مجھے تم چاہتی بھی ہو
مجھے تم مانگتی بھی ہو
کہ جب جب تم یہ کہتی ہو
میں تب تب تم سے کہتا ہوں
نہیں رہ پاؤں گا تم بن
نہیں جی پاؤں گا تم بن

میں جب جب تم سے لڑتا ہوں
یقین جانو میرے ہمدم
میرا دل مجھ سے کہتا ہے
تم اپنی جاں کے دشمن ہو
اس تم کیوں ستاتے ہو
مگر میں کیا کروں جاناں !
ہمیشہ راز رکھو گی
میں جب جب تم سے لڑتا ہوں
میری آنکھیں برستیں ہیں
میں روتا ہوں، سسکتا ہوں
تمہارا عکس آنکھوں میں
بٹھا کر پہروں تکتا ہوں
نہیں ہے تم پہ بھی واجب
کہ چاہو مجھ کو ایسے ہی
کبھی تم کو خیال آئے
ہمیشہ راز رکھو گی
میں جب جب تم سے لڑتا ہوں

سید احمد
11-IE-47

میری آنکھیں برستیں ہیں
میں روتا ہوں، سسکتا ہوں
تمہارا عکس آنکھوں میں
بٹھا کر پہروں تکتا ہوں
نہیں ہے تم پہ بھی واجب
کہ چاہو مجھ کو ایسے ہی
کبھی تم کو خیال آئے

تمہارے پیار میں کچھ بھی
کمی میں سہہ نہیں سکتا
میں تم سے کہنا چاہتا ہوں
کہ ہاں قابل ہو تم میرے
کہ اب جاناں تمہارے بن
نہیں مجھ کو کئی بھاتا

یہ نظریں تجھ کو تکتی ہیں
یہ دل تجھ کو ہی چاہتا ہے
میرا تم سے یہ وعدہ ہے
سدا تم کو ہی چاہوں گا
نہ کوئی دکھ تجھے دوں گا

میرا سے یہ وعدہ ہے
مگر تم ہے التجا تم سے
کہ ہونا ہے تمہیں میرا
تمہیں اک راز بتلاؤں
مگر وعدہ کرو مجھ سے
میرے اس راز کو تم جاں

اچھا تو تم صحرا ہو

اچھا تو تم صحرا ہو، پھر تو تمہارا ہر زرہ ستارہ ہو گا
تمہاری شام کتنی پیاری ہو گی کیا رات کا نظارہ ہو گا

ساحل کے ساتھ چلتے چلتے ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے
اک خواب تھا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے

اک دوجے کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کہیں کھو جاتے
سفر جیون کا طے کرتے گرتے پڑتے

جس کو انا کہتے ہو، ہم دلوں والوں سے کیا کام اسے
جو کہو تو جی اٹھیں گے، جو چاہو تو مر جائیں گے

تم تنہا نہیں اب جیون میں
اک ساتھی ساتھ تمہارے ہے

ہر سو اندھیرا ہے میں ہوں اور میرے تنہائی ہے
تیری یاد بن کے روشنی میرے دل میں اتر آئی ہے

ڈاکٹر فیاض طاہر
سول انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ

غزل

اب کے غم دوراں سے رعایت نہ کریں گے
اک درد و غم دل پہ کفایت نہ کریں گے

ہم بات کریں گے تو بنے گی وہ بتنگڑ
اے حُسن! ترا قصہ روایت نہ کریں گے

یہ کس نے اُڑائی ہے کہ مجنوں ہے فسانہ ؟
ہم ایسی حقیقت کو حکایت نہ کریں گے

جو جی کہہ کر گزریے ہم اہلِ جنوں پر
خاموش رہیں گے، ہاں شکایت نہ کریں گے

سنتے ہی رہے آپ کی اس وقت سے ابتک
کچھ بندہ کی سننے کی عنایت نہ کریں گے ؟

سن لو! اے حسینو! ہوا رسوا جواب عاشق !
مشکل میں تمہاری بھی حمایت نہ کریں گے

اس موسمِ گل میں کہ طبیعت بھی ہے حاضر
اُٹھیے بھی حسن! شغلِ غنایت نہ کریں گے ؟

مصرع طرح جوخودنہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے
بحر فعلن ، فعلتن ، فعلتن ، فعلتن

حسن سرفراز
11-IE-47

غزل

کوئی تارا سرِ زمیں ہوتا
کوئی میرا بھی ہم نشیں ہوتا
جو سمجھتا زبان آنکھوں کی
کوئی اتنا فقط ذہیں ہوتا
میں جو ہنستا تو ساتھ ہنستا وہ
کوئی غم میں میرے حزیں ہوتا
کوئی دل میں مجھے جگہ دیتا
کوئی دل کا میرے مکیں ہوتا
کوئی کرتا وفا جو وعدے سب
کوئی تنہا کبھی نہیں ہوتا
تم بھی تنہا کبھی نہیں ہوتے
تم کو جاذبؔ اگر یقیں ہوتا

سعد طارق جاذب
11-SE-165

غزل

خدا جانے طلب کیسی، کشش کیسی وجہ کیسی
انہی کی جستجو اب بھی نجانے یہ سزا کیسی

نگاہ یار میں کھو کر کٹی راتیں، ڈھلی شامیں
ان آنکھوں میں غضب کیسا، ادا کیسی، بلا کیسی

وہ ہمکو دیکھ کر ان کا ٹھٹھک جانا، سہم جانا
نجانے مل گئی ان کو کہاں سے یہ ادا ایسی

سکونِ بحر کی طرح ، صدائے سحر کی مانند
آواز انکی قرارِ جان، غمِ دل کی شفاء جیسی

ملائک سے پاکیزہ کیوں لگتا ہے وجود ان کا
حجاب امبریں میں کیوں وہ لگتی ہے دُعا جیسی

ادائے بے نیازی بھی ہے شامل ان کی فطرت میں
سمجھ ہم کو نہیں آتا، کیوں چاہت میں انا ایسی

تیری صورت کو بھی اک دن عمر وہ بھول جائیں گے
انہیں تم سے غرض ہی کیا ؟ وفا کیسی جفا کیسی؟

محمد عمر لودھی
13-SE-82

غزل

خدا کو اپنا رب تو کہا، ایمان کی حلاوت پا نہ سکا
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

تکبیر لگادی نعروں میں، اسلام کے نام نہادوں نے
تو ٹھنڈے خوں کا مالک ہے، پائے کا جہادی بن نہ سکا

پیدا ہوا جس کام کو میں، اک عمر ہوئی اسے بھول گیا
دل اپنا صنم کا تابع ہے، بندے کا عکاسی بن نہ سکا

گلشن کر ڈالا سیپارہ، قوم کے ان غداروں نے
نفس ہمارا امارہ، دھرتی کا سپاہی بن نہ سکا

یہ قلم کی حرمت کیا جانے، امید کا تارا تو نہ بنا
فرقہ واری کا یہ مارا، انصاف کا قاضی بن نہ سکا

نفیسہ بی بی
13-SE-02

غزل

جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے
اغیار کے افکار کی حمایت نہ کریں گے

اسے چاہا ، اُسے چھوڑا اور بولا تھا وہ شخص
ہم ایک ہی ہستی پہ کفایت نہ کریں گے

ایسے بے حس لوگوں سے پڑا ہے پالا
یہ غم بھی کبھی کھل کے عنایت نہ کریں گے

ہر شے کی ہے اک حد مگر یہ کیا میرے ہمدم
کہ مر بھی اگر جائیں تو شکایت نہ کریں گے

ایسے پتھروں سے راہ میں پھوڑا ہے ہم نے سر
ہو دوست کہ دشمن وہ رعایت نہ کریں گے

لفظوں کے کھلاڑی بھی نہیں لکھتے میرا قصہ
ہے بات ہی ایسی، وہ روایت نہ کریں گے

بہر مصلحت ہی رہے عمر بھر ہم تنہا
ہو کوئی ساتھ تو لوگ حکایت نہ کریں گے

امِّ ہانی
11-SE-21

غزل

پیاسا واپس ہی سکندر کو بھی لانے والا
خضر ہوتا نہیں ہر راہ دکھانے والا
اب کوئی درد کسی اور کے دل کا یارو
چھیڑ جاتا ہے میرا درد پرانے والا
ہم نے چاہا تھا جسے سارے جہاں سے بڑھ کر
ہے وہی شخص میرے پاس نہ آنے والا
اس کا ملنا ہی نصیبوں میں نہیں تھا شاید
ورنہ کیا مجھ کو میسر نہ تھا آنے والا
کیا بتاؤں کہ سبھی عشق تھے میرے اس سے
اس کا چہرہ ہی تھا سب چہروں میں آنے والا
میں تو قائل ہوں محبت میں بھی یکتائی کا سن!
اور نہیں کوئی اب اس دل میں سمانے والا
منہ چھپا کے کہیں ذیشانؔ وہ رویا ہوگا
کرکے رُسوا مجھے محفل سے اُٹھانے والا

ذیشان خالق چودھری
11-CE-189

غزل

زمانے کے افسردہ حالات دیکھے
محبت کے سارے کمالات دیکھے

غنیمت سے ملنا ہے غم بھی اے غافل
ہمی تھے کہ کیا کیا تھا مقامات دیکھے

یہ دنیا میں رہنا بھی ہے اک قیامت
مقدر بدلتے ہر اوقات دیکھے

ابھی کوئی خواہش نہیں پہلے جیسی
تضادات میں گزرتے لمحات دیکھے

ہے تسکین تو صرف رب کی رضا میں
مسلمان کے ہم نے حالات دیکھے

بنایا ہے مقصد خوشی صرف اُس کی
پریشان کن جو خیالات دیکھے

اعزاز کاشف
12-ME-94

غزل

لمحے ماضی کے جو یاد آتے ہیں
بہتری کے لئے اُکساتے ہیں
توڑنا پھر سے بندھانا توبہ
رکھ کر آس آپ سے پچھتاتے ہیں
حال نفرت میں نہ جانے کیا ہو
جب محبت میں تڑپ جاتے ہیں
دل کا بگڑا ہے سُدھرنا مشکل
یوں تو سب ہی اُسے سمجھاتے ہیں
وقت بھی چارہ گری کرتا ہے
صبر والے جو یہ پھل کھاتے ہیں
کیا جدا آپ ہوئے ہم سے حسینؑ
سخت بیمار ہوئے جاتے ہیں

محمد حسین بلال
13-ME-58

غزل

رہو خانہ دل میں مرے سکون کے ساتھ
تیرا وجود میری آنکھ کی امان میں ہے
جسے تلاش کیا نہ کہاں کہاں میں نے؟
سنا ہے اس کی سکونت میرے دھیان میں ہے
کوئی سنبھالے کیوں میرا کاروبارِحیات ؟
تمام جنس ادھاری میری دکان میں ہے۔
قفس میں چوری ملے تو حیات بے معنی
نڈھال بھوک سے بھی ہوں مزا اڑان میں ہے
خشوع سے خالی نمازیں قبول کیونکر ہوں
ذرا نہ سوزِ بلالی میری اذان میں ہے۔
پڑھو درود محمد پہ آل پر اس کی
اسی عمل کی تو تاکید بھی قرآن میں ہے
وفا کے نام پہ اتنا ڈسا گیا میثم
یقین وفا کا مقید میرے گمان میں ہے۔

بشارت عباس میثم
(وی سی آفس، یو ای ٹی تیکسلا)

غزل

بے یقینی کی انتہا کر دے
خود کو مجھ سے علیحدہ کر دے
عکس کو دے کوئی نیا معنی
آئینے سے اسے رہا کر دے
اس کی آنکھیں اگر اجازت دیں
دل بیاں اپنا مدعا کر دے
چھیڑ پھر قصۂ مسیحائی
دیوتاؤں کو یوں خفا کر دے
تیرے در پر ہی بھول آیا تھا
میری آنکھیں مجھے اٹھا کر دے
میں بھی منزل سے جا ملوں ساجد
تو مرے واسطے دعا کر دے
(ساجد مسعود)

ساجد مسعود
10-SE-155

غزل

کچھ منافع نہ محبت میں خسارے پر ہیں
یہ غنیمت ہے کہ ہم لوگ گزارے پر ہیں

عین ممکن ہے کہ اب روح بھی چیری جائے
جاں ہتھیلی پہ لئے عشق کے آرے پر ہیں

ان پرندوں کی اڑانوں سے مجھے خوف نہیں
یہ پرندے تو ہواؤں کے سہاروں پر ہیں

موج در موج روانی کا پتہ کیسے چلے؟
یار ہم لوگ تو دریا کے کنارے پر ہیں

دل کی تصویر جو چھوتی ہے مصور پر ہے
آنکھ میں رنگ جو بھرتے ہیں نظارے پر ہیں

صرف اڑنے کی تمنا سے کوئی اڑتا ہے؟
نہ ہواؤں سے ہے یاری نہ تمہارے پَر ہیں

ہم تو محنت سے مشقت سے یہاں پہنچے ہیں
اور کچھ لوگ دعاؤں کے سہارے پر ہیں

اشک گرتے ہیں تو یہ راکھ سلگتی ہے شکیلؔ
ہم جو جلتے ہیں محبت کے شرارے پر ہیں

شکیل شاکی (حلقہ تخلیقِ ادب ٹیکسلا)